مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی

شخصیت اور خدمات

تحریر و تاثرات

خواجہ رضی حیدر

مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی

شخصیت اور خدمات

تحریر و تاثرات

خواجہ رضی حیدر

سورتی اکیڈمی

۲ ڈی-۵/۱۶، ناظم آباد نمبر ۲۔ کراچی

تحریر و تاثرات: خواجہ رضی حیدر

نام کتاب: مولانا رضا انصاری فرنگی محلی

اہتمام: ولی حیدر، ڈاکٹر سید محمد اسلم غزالی

سرورق خطاطی: استاد عبدالسلام سدیدی

ناشر: سورتی اکیڈمی ۳ڈی ۱۶/۵ ناظم آباد، کراچی، پاکستان

تاریخ اشاعت: نومبر ۱۹۹۲ء

تعداد اشاعت: ایک ہزار

مطبع: احمد برادرز پرنٹرز، ناظم آباد، کراچی

بھارت میں ملنے کے پتے:

* معین احمد صوفی، شمع کٹ پیس ہاوس، رام سروپ پارک، ہیلی بھیت، یوپی۔
* والی آسی، مکتبہ ادب، چوک امین الدولہ پارک، لکھنؤ، یوپی۔
* محمد عاصم صابری، چھوٹی عید گاہ، نئی سڑک کانپور، یوپی۔

انتساب

والدۂ مرحومہ سیّدہ خاتون کی روحِ پُرفتوُح کے نام

وہ ہاتھ تہہِ خاک بھی مصروفِ دعا ہیں
دنیا میں جو اٹھتے تھے مرے حق میں دعا کو

مدعا یہ ہے کہ......

خواجہ رضی حیدر میرے بڑے بھائی ہیں اور ہم سب ان کو "بھائی صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں لہٰذا بھائی صاحب کی کسی تحریر کے آغاز پر بطور تعارف کچھ لکھنا میرے لئے بڑا کٹھن کام ہے۔ مگر سورتی اکیڈمی کے اعزازی ناظم کی حیثیت سے یہ میرے فرائض منصبی میں شامل ہے کہ میں سورتی اکیڈمی سے شائع ہونے والی ہر کتاب پر "عرض ناشر" کے طور پر کچھ تحریر کروں۔ اس لئے میں یہاں اپنی گزارشات رقم کرنے پر مجبور ہوں۔ چنانچہ میں اگر کہیں بھائی صاحب کے تعارف میں بلند آہنگ ہوجاؤں تو قارئین مجھے معاف فرمائیں۔ پیشگی معذرت اس لئے بھی ضروری ہے کہ بھائی صاحب سے قلبی تعلق کی بنا پر نہ چاہتے ہوئے بھی بلند آہنگی سے گریز میرے لئے ممکن نہیں۔ بھائی صاحب مجھ سے عمر میں اتنے بڑے ہیں کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو والد مرحوم حضرت مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی کے بعد بھائی صاحب کی ہی ذات ہمارے نزدیک مثالیہ تھی۔ والد مرحوم چونکہ طبابت کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی وابستہ تھے۔ اس لئے بھائی صاحب نے ان کی سرپرستی میں ہی صحافتی اور تصنیفی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ خوش قسمتی سے دوران تعلیم ہی ان کو ۱۹۶۶ء میں روزنامہ حریت کراچی میں بحیثیت سب ایڈیٹر باقاعدہ ملازمت مل گئی جس کی بنا پر نہ صرف ان کے ذوق وشوق میں اضافہ ہوا بلکہ تحریر میں بھی ایک "جماؤ اور رچاؤ" آگیا۔ مطالعہ کی کثرت سے مزاج میں سنجیدگی پیدا ہوئی اور فیچر رائیٹنگ وافسانہ نگاری سے کنارہ کش ہو کر وہ ایسے موضوعات کی طرف نکل گئے جو ہماری ماضی قریب کی تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی انہوں نے تحریک پاکستان اور قائداعظم کی حیات و خدمات کو اپنی تحریروں کا "مرکزیہ" بنایا۔ بحیثیت اخبار نویس ان کو ایسے افراد کی صحبت اور قربت بھی میسر آئی جو خود اس تاریخ کا حصہ تھے۔ ان افراد میں قائداعظم کے پرائیوٹ سکریٹری مطلوب الحسن سید، مولانا حسن مثنیٰ ندوی، مولانا ظفر احمد انصاری، چودھری خلیق الزمان، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا ابن حسن

جارچوی، سید حسین امام، حاتم علی علوی، نواب صدیق علی خان، مولانا
عبدالقدوس بہاری، حکیم اسرار احمد کریوی، قائداعظم کے اسٹینو گرافر مجاہد
حسین، سید ہاشم رضا، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور پروفیسر شریف المجاہد نہ
صرف قابل ذکر ہیں بلکہ ان میں سے اکثر کے بارے میں بھائی صاحب کے
مضامین میں یا انٹرویوز اخبارات ورسائل میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے
اوائل میں مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں کی شورش، بھارتی جارحیت اور
آخرکار سقوط مشرقی پاکستان نے بھائی صاحب کے اندر وطن دوستی کو فروغ
دیا اور انہوں نے مارچ ۱۹۷۲ء تک مسلسل سقوط مشرقی پاکستان کے اسباب و
عوامل کے حوالے سے مضامین لکھے۔ اس دوران روزنامہ حریت کے اسسٹنٹ
ایڈیٹر اور معروف ادیب و شاعر عبدالرؤف عروج کے مشورہ پر بھائی صاحب
نے "قائداعظم محمد علی جناح" کی سوانح عمری پر کام شروع کیا اور دسمبر
۱۹۷۶ء میں ان کی پہلی کتاب "قائداعظم کے ۷۲ سال" شائع ہوئی۔ یہاں یہ
بات قابل ذکر ہے کہ ۱۳ مئی ۱۹۷۶ کو اچانک حرکت قلب بند ہوجانے کی بنا
پر والد صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ نتیجہ یہ کہ بھائی صاحب کی ذمہ
داریاں دوہری ہوگئیں مگر اقتصاد کی گراں باری کے باوجود انہوں نے اپنی
کتاب کی تکمیل کو پیش نظر رکھا اور مسلسل اپنا کام کرتے رہے۔ یہاں یہ بات
بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۹۷۶ء میں قائداعظم کا صد سالہ جشن پیدائش بین
الاقوامی سطح پر منایا جارہا تھا۔ مگر ایک نوآموز مصنف کی کتاب کی اشاعت کے
لئے کوئی پبلشر تیار نہ تھا۔ بھائی صاحب نے کئی پبلشروں سے گفتگو کی اور پھر
تھک ہار کر ایک اشاعتی ادارہ "سورتی اکیڈمی" قائم کرکے اس کے زیراہتمام
"قائداعظم کے ۷۲ سال" شائع کردی۔ اس کتاب کی اشاعت کے لئے بھائی
صاحب کے ایک عزیز دوست نے اکیڈمی سے تعاون کیا اور اس طرح نہ
صرف بھائی صاحب مصنف کے زمرے میں داخل ہوگئے بلکہ "سورتی اکیڈمی"
بھی متعارف ہوگئی۔ "سورتی اکیڈمی" کا نام دراصل والد مرحوم کے مطب
"سورتی دواخانہ" کی ترکیب پر رکھا گیا جو والد صاحب کے انتقال کے بعد بند

ہو گیا تھا۔ یہ دواخانہ والد مرحوم نے اپنے دادا اور محدث بے نظیر حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی کی یاد میں قائم کیا تھا کیونکہ حضرت محدث سورتی کا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل آبائی وطن "سورت" تھا اور بعد میں انہوں نے اپنے پیرو مرشد حضرت شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادیؒ کے ایما پر یوپی کے شہر "پیلی بھیت" کو اپنا مستقل مستقر بنالیا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ سورتی اکیڈمی سے "قائداعظم کے ۲۷ سال" شائع ہونے کے بعد اکثر افراد نے "سورتی" کی وجہ تسمیہ دریافت کی چنانچہ اس وضاحت کی بنا پر "حضرت محدث سورتی" سے بھائی صاحب کی روحانی اور نسبی وابستگی کو کچھ ایسا فروغ ملا کہ انہوں نے "حضرت محدث سورتی" کے مستقل تعارف کے لئے ایک کتاب لکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ علم دین کے حوالے سے رجال اور اکابر کی تاریخ اور تذکرہ لکھنا کوئی آسان بات نہیں اور پھر ایک ایسے شخص کے لئے جو صرف دنیاوی علوم سے مزین ہو تقریباً ناممکن ہے مگر بھائی صاحب نے اس ضمن میں اپنے مطالعہ کو اتنا طول دیا کہ ماضی قریب کے علماء کی تاریخ ان کو تقریباً ازبر ہو گئی۔ انہوں نے تین چار سال کے عرصہ میں جہاں ایک طرف "تذکرہ محدث سورتی" کے لئے مواد و معلومات کو یکجا کیا وہاں دوسری طرف علماء کی سوانح میں متعدد ایسے مضامین تحریر کئے جن کو اہل علم نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ خصوصاً حکیم محمد موسیٰ امرتسری، حکیم سید محمود احمد برکاتی، ڈاکٹر مختارالدین احمد، مولانا عبدالحکیم شرف قادری، علامہ محمود احمد قادری کانپوری، پروفیسر محمد ایوب قادری، مولانا جمیل احمد نعیمی، راجا رشید محمود، مولانا عبدالمنعم ہزاروی مرحوم، علامہ شاہ تراب الحق قادری اور مولانا شاہ حسین گردیزی نے بھائی صاحب کی خصوصی حوصلہ افزائی فرمائی اس طرح مئی ۱۹۸۱ء میں تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل "تذکرۂ محدث سورتی" شائع ہو گیا۔ اس تذکرہ کی اشاعت نے کسی حد تک یہ بات بھی طے کردی کہ بھائی صاحب ہندوستان کی جدید تاریخ کے اکابر و علماء کی تاریخ و سوانح پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔

جون ۱۹۸۱ء میں قائداعظم اکادمی سے بحیثیت ریسرچ فیلو وابستگی کے

بعد بھائی صاحب نے خود کو بڑی حد تک تحریک پاکستان اور قائد اعظم تک محدود کر لیا اور ان موضوعات پر ان کی چند کتابیں قائد اعظم اکادمی اور نفیس اکیڈمی سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ رسائل واخبارات میں ان کے تقریباً دو سو مضامین ومقالے طبع ہوئے مگر علماء کی سوانح میں کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جسکو تزکرہ محدث سورتی جیسی مقبولیت ملتی۔ ادھر کچھ عرصہ سے بھائی صاحب نے علماء کی سوانح میں کچھ تاثراتی مضامین تحریر کئے۔ ان میں ایک مضمون ندوۃ المصنفین کے ڈائرکٹر اور معروف اسکالر مولانا صباح الدین عبدالرحمان پر بھی تھا جسے میں کتابچہ کی صورت میں شائع کرنا چاہتا تھا مگر والدہ کی علالت نے مہلت نہ دی اور بعد میں اسے پروفیسر وسیم فاضلی نے سٹی کالج کراچی کے سالانہ مجلّہ میں شامل کر دیا۔ اب بھائی صاحب نے فرنگی محل کے ایک عالم دین مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی پر ایک طویل مضمون ذاتی حوالے سے لکھا ہے جو پرتاثیر بھی ہے اور معلومات افزاء بھی۔ یہ مضمون جب میں نے پڑھا تو بھائی صاحب سے اسے کتابچہ کی صورت میں شائع کرنے کی اجازت چاہی۔ بھائی صاحب نے مجھے اجازت دیدی چنانچہ یہ طویل تاثراتی مضمون آپکی خدمت میں کتابچہ کی صورت میں حاضر ہے۔ شاید مولانا رضا انصاری فرنگی محلی پر یہ پہلا مضمون ہے جس میں ان کی حیات و خدمات اور شخصیت کا بھرپور انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتابچہ نہ صرف اہل علم میں پسند کیا جائے گا بلکہ سورتی اکیڈمی کی مطبوعات میں بھی ایک گرانقدر اضافہ ثابت ہوگا۔ میں آخر میں بھائی صاحب کی عمر، علم اور توفیقات میں اضافے کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعا گزار ہوں آپ بھی میری دعا میں شریک ہو جائیں۔

طالب دعا

ولی حیدر ذاکر

یکم اکتوبر ۱۹۹۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزشتہ دنوں میں Cristopher Shackle کی مرتب کردہ کتاب Urdu and Muslim South Asia کا مطالعہ کر رہا تھا تو اس کتاب میں شامل لندن کے ایک پروفیسر Francis Robinson کا مضمون نظر سے گزرا جس کا عنوان تھا An Nizamiyya: a Group of LucknowIntellectuals in the early Twentieth Century پروفیسر رابن سن نے اس مضمون میں بیسویں صدی کے آغاز پر فرنگی محل لکھنؤ کے علماء کی خدمات کا رسالہ "النظامیہ" کے حوالے سے جائزہ لیا تھا۔ میں جوں جوں اس مضمون کو پڑھتا گیا میرے ذہن میں بیسویں صدی کے انجام پر فرنگی محل کے ہی ایک عالم، صحافی، محقق اور ادیب مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی مرحوم کی یاد تازہ ہوتی چلی گئی جن سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا مجھے کئی مرتبہ شرف حاصل ہو چکا تھا۔ پروفیسر رابن سن کے مضمون کے اختتام پر میرے دل نے بے اختیار گواہی دی کہ مولانا مفتی رضا انصاری فرنگی محلی کے بارے میں ایک مضمون، جو بطور قرض مجھ پر واجب ہے، لکھنے کا وقت آگیا ہے۔ میں نے اپنے دل کی گواہی کا احترام کرتے ہوئے Cristopher Shackle کی کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور اپنی پرانی ڈائریاں اٹھا لیں جن میں وقتاً فوقتاً میں نے مولانا رضا انصاری فرنگی محلی سے اپنی ملاقاتوں کا احوال اور تاثرات درج کر رکھے تھے۔

اکتوبر ۱۹۷۹ء تک مفتی محمد رضا انصاری کے بارے میں میری معلومات بہت محدود تھیں۔ بس میں یہ جانتا تھا کہ وہ ادیب و صحافی ہیں، انجمن ترقی پسند مصنفین کے ابتدائی ارکان میں ان کا شمار ہوتا ہے اور اپنی ترقی پسندانہ روش کی بنا پر ایک عرصہ تک عالم دین ہونے کے باوجود ان پر کمیونسٹ ہونے کا لیبل لگا رہا ہے ابتدا ہی وہ تضاد تھا جس نے ان کی شخصیت میں میرے لئے ایک Charm پیدا کردیا تھا اور میں ان کے بارے میں مزید کچھ جاننے کا خواہشمند رہتا تھا۔ میری اسی خواہش کو دیکھتے ہوئے پروفیسر محمد ایوب قادری نے مجھے ان کے دو مضامین کی فوٹو کاپی فراہم کی جو "معارف" اعظم گڑھ میں شائع ہوئے تھے۔ پھر ان کی ایک کتاب "بانیٔ درس نظامی" میری نظر سے گزری مگر "تذکرۂ محدث سورتی" کی تالیف کے دوران جب میں نے اپنے بزرگوں کے حالات کا مطالعہ کیا تو عقدہ کھلا کہ میرے بزرگوں کا بھی فرنگی محل سے قدیم علمی تعلق رہا ہے۔ خصوصاً میرے دادا حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتیؒ کے مولانا محمد یوسف فرنگی محلیؒ (داماد مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ) سے دیرینہ مراسم تھے بلکہ مولانا محمد یوسف نے اپنے "مطبع یوسفی" سے حضرت محدث سورتی کی فقہ میں معرکہ آرا کتاب "التعلیق المجلی لما فی منیۃ المصلی" بھی شائع کی تھی۔ مزید برآں حضرت محدث سورتی کے برادر خورد مولانا عبداللطیف سورتی کو مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا اور انہوں نے اپنے استاد کی عقیدت و محبت میں اپنے بڑے صاحبزادے کا نام بھی عبدالحی رکھا تھا۔ یہی عبدالحیؒ حضرت محدث سورتی کے وصال کے بعد ایک عرصہ تک مدرسۃ الحدیث پیلی بھیت میں فتویٰ نویسی اور درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ میرے والد مرحوم مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی نے انہی مولانا عبدالحی سے، جو رشتہ میں میرے والد کے چچا

تھے ، درس نظامی کی ابتدائی کتب پڑھی تھیں چنانچہ ان کو مولانا عبدالحئی پھلی پھیتی سے ایک خاص ربط و تعلق تھا اور وہ اکثر مولانا عبدالحئی پھلی پھیتی کے علم و فضل ، زہد و تقویٰ اور بے نفسی کا ذکر کیا کرتے تھے ۔ ان کا کہنا تھا کہ مولانا عبدالحئی نسباً بڑی مضبوط پشت کے آدمی تھے لیکن تمام عمر انہوں نے سادگی اور گوشہ نشینی کو عزیز رکھا ۔ گویا فرنگی محل اور خصوصاً مولانا رضا انصاری کی طرف میری رغبت ایک روحانی حکایت تھی اور یہ حکایت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک کہ سامع کا دیدۂ دل وا نہ ہو ۔

بہر حال اکتوبر ۱۹۷۹ء میں وہ ساعت بھی آ پہنچی جب میں رضا لائبریری رامپور میں پہلی مرتبہ مولانا رضا انصاری فرنگی محلی کی زیارت سے مشرف ہوا ۔ میں اُن دنوں اپنی زیر تالیف کتاب "تذکرۂ محدث سورتی" کے لئے مواد و معلومات کی تلاش میں بھارت کے مختلف علمی مراکز کے دورے پر تھا ۔ رضا لائبریری رام پور اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی ۔ معروف محقق مولانا امتیاز علی عرشی جو رضا لائبریری کے ناظم اعلیٰ تھے ، اگر چہ ان دنوں صاحب فراش تھے ، لیکن میرے ہمراہ رام پور کی ایک ہر دلعزیز شخصیت سوار والے حسن میاں کو دیکھ کر جو میرے والد کے پھوپھی زاد ہیں میری رہنمائی پر آمادہ ہوگئے ۔ رضا لائبریری کے ایک کارکن عتیق جیلانی صاحب کو میری امداد پر مامور فرما دیا اور میں تقریباً پندرہ دن تک لائبریری میں کام کرتا رہا ۔ اسی دوران ایک دن عتیق جیلانی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ مولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی عربی کے ایک قدیم خطی نسخہ کی تصحیح کے لئے جس کی ایک نقل لائبریری میں محفوظ ہے رام پور آئے ہوئے ہیں ۔ میں نے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تو عتیق جیلانی نے بتایا کہ " لائبریری سے متصل" رنگ محل " نامی مہمان خانے میں ان کا قیام ہے ۔ شام کو چلے جائیے گا " شام کو میں نے مہمان خانے کے دروازہ

پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی ۔ "آیئے" میں اندر داخل ہوگیا ۔ مہمان خانے کے ایک وسیع و عریض کمرے کے درمیان ایک مسہری پڑی ہوئی تھی اور شمالی دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ ۔ مولانا رضا انصاری فرنگی محلی اسی صوفہ پر بیٹھے تھے اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میں سامنے میز پر رکھی ہوئی ایک کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھے ۔ میں نے سلام عرض کیا تو گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔ "جی فرمایئے" میں چند قدم اور آگے بڑھ گیا اور عرض کیا "طالب علم ہوں کراچی سے تعلق ہے آپ کی زیارت کے اشتیاق میں حاضر ہوگیا ہوں " مولانا نے بائیں ہاتھ سے اپنی ناک پر قدرے لٹکی ہوئی عینک کو درست کیا اور قریب بلا کر بٹھا لیا فرمانے لگے زرا بیٹھو پھر گفتگو کریں گے ۔ یہ پیراگراف مکمل کرلوں ۔ میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی اور مولانا پھر سامنے کھلی ہوئی کتاب پر جھک گئے ۔ اس دوران میں نے مولانا پر ایک نگاہ ڈالی ۔ "دبتا ہوا قد، چوڑے شانے ، سر پر کپڑے کی چوگوشیہ ٹوپی ، آنکھوں پر عینک ، طویل اور بے ترتیب داڑھی ، لٹھے کا کرتا اور علی گڑھ کٹ کا پائجامہ ، آواز میں معمولی کرختگی ، چہرے پر قدماکی سی متانت۔ ابھی میں غور کر ہی رہا تھا کہ مولانا نے کتاب بند کر کے ایک طرف سرکادی اور دونوں پیر موڑ کر صوفے پر رکھ لئے پھر ایک طویل سانس لیا۔ شاید یہ سانس ایک لمحہ سے نکل کر دوسرے لمحے میں داخل ہونے کے لئے ایک ذہنی جست تھی ۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پاکر دریافت کیا" کراچی میں جناب کا کیا مشغلہ ہے " ۔ میں نے عرض کیا "ایک اخبار سے منسلک ہوں" ان کی آنکھیں چمک اٹھیں ۔ بولے ۔ "اچھا صحافی ہو۔ کیا ذمہ داری ہے اخبار میں " میں نے کہا۔ " ویسے تو شعبۂ خبر سے وابستہ ہوں لیکن ادب اور تاریخ سے متعلق مضامین بھی لکھتا رہتا ہوں خصوصاً تحریک پاکستان اور علماء کی

تاریخ سے زیادہ دلچسپی ہے ۱۹۷۶ میں قائداعظم محمد علی جناح کی سوانح میں ایک کتاب بھی شائع ہوچکی ہے" مولانا نے ماشاءاللہ کہتے ہوئے فرمایا" پھر تو آپ ہمارے قبیلہ کے آدمی ہیں۔ نہ صرف اردو اور تاریخ ہمارا موضوع ہے بلکہ ایک عرصہ تک ہم اخبار سے بھی منسلک رہے ہیں" پھر دریافت فرمایا "کراچی کے قدیم باشندے ہیں یا مقیم" میں نے عرض کیا آبائی تعلق پیلی بھیت سے ہے۔ تقسیم کے بعد والدین نے ہجرت کر کے کراچی میں سکونت اختیار کرلی تھی" مولانا نے پیلی بھیت کا نام سنا تو ان کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی۔ فرمانے لگے "پیلی بھیت سے تو لکھنؤ والوں کا بڑا قدیم سمبندھ ہے۔ پیلی بھیت کے کئی علماء نے فرنگی محل کے مدرسۂ عالیہ نظامیہ سے پڑھا ہے۔ بلکہ پیلی بھیت کے ایک معروف حکیم سعیدالرحمٰن خان کی صاحبزادی کی شادی لکھنؤ کی ایک معروف شخصیت اصطفاء خان کے بیٹے اکبر خاں سے ہوئی تھی جس کے بعد پیلی بھیت سے لکھنؤ آنے والے "حنا منزل" میں ٹھرا کرتے تھے اور لکھنؤ سے پیلی بھیت جانے والے حکیم سعیدالرحمٰن خان کی ڈیوڑھی میں اترتے تھے ایک مرتبہ میں بھی پیلی بھیت گیا تھا اور حکیم سعیدالرحمٰن خان کے ہاں قیام کیا تھا بڑے صاحب علم اور وضعدار آدمی تھے۔ اب تو ایسے لوگ ناپید ہوگئے ہیں" مفتی صاحب کی آواز اچانک بدل گئی جیسے وہ قحط الرجال کے حوالے سے کسی گہرے ملال میں چلے گئے ہوں۔

اس دوران میں نے مفتی صاحب کو بتایا کہ میں ان دنوں پیلی بھیت کے ایک عالم دین حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتیؒ پر کام کر رہا ہوں اور اسی غرض سے بھارت آیا ہوں۔ محدث سورتی کا نام سن کر مفتی صاحب کا چہرہ ایک دم بدل گیا اور پھر وہ دیر تک ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندوستان میں رونما ہونے والی مختلف مذہبی تحریکات اور ان تحریکات کے نتیجہ میں پیدا

ہونے والے اختلافات پر گفتگو کرتے رہے ۔ اس گفتگو کے دران میں نے
اندازہ لگایا کہ مفتی صاحب ہندوستان کی علمی و مذہبی تاریخ پر مکمل عبور رکھتے ہیں
اور اس ضمن میں ان کا مطالعہ بہت روشن ہے ۔ ان کو اردو ، فارسی ، عربی ،
انگریزی اور ہندی پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ وہ ان زبانوں میں تصنیف و
تالیف کا کام باآسانی کرسکتے ہیں ۔ اس دن مفتی صاحب تقریباً دو گھنٹہ تک ایسی
جامع اور مدلل گفتگو فرماتے رہے کہ میرے ذہن کی بے شمار گرہیں کھلتی چلی
گئیں ۔ اذان عشاء پر جب میں نے مفتی صاحب سے اجازت طلب کی تو آپ
نے فرمایا میں کل بھی ہوں۔ بعد نماز عشاء ٹرین سے لکھنوچلا جاوں گا ۔ میں
نے اس اطلاعی رمز کو بھانپ لیا اور عرض کیا " میں کل بھی اسی وقت حاضر
ہوجاوں گا " مفتی صاحب نے میرا جملہ مکمل ہوتے ہی فی امان اللہ کہہ دیا اور
میں مصافحہ کر کے باہر نکل آیا۔

اگلی شام جب میں حاضر ہوا تو مفتی صاحب اس جگہ اسی طرح بیٹھے
ہوئے مطالعہ میں مصروف تھے جیسے گزشتہ شام سے مسلسل اسی طرح بیٹھے
ہوئے ہوں ۔ آج میں چونکہ ذہنی طور پر تیار ہوکر آیا تھا اس لئے میں نے
رسمی گفتگو کے بعد فرنگی محل کے علماء کی خدمات کے بارے میں گفتگو چھیڑدی ۔
مفتی صاحب نے میرے ایک سوال کاجواب دیتے ہوئے فرمایا۔ مسلک اہلسنت
وہی ہے جس کی تائید و توثیق شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تصانیف سے ہوتی
ہے ۔ بعض امور میں ہمارے مابین باہمی اختلافات بھی ہوئے ہیں لیکن ہمارا
بنیادی موقف ایک ہی رہا ہے ۔ اس لئے جب ہم "اہلسنت " کا لفظ استعمال
کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں حضرت امام ابوحنیفہؒ اور شیخ عبدالحق محدث
دہلویؒ کا ہی موقف ہوتا ہے ۔ وہ موقف جس پر فرنگی محل ، خیرآباد ، دہلی ،
بدایوں اوربریلی کے معروف علمی خانوادے نہ صرف شدت سے کاربند رہے بلکہ

انہوں نے اس موقف کے تحفظ اور وکالت میں اہم کردار بھی ادا کیا۔ میں کہتا ہو کہ "سنیت" کو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ وضاحت کی تو ان مسالک کو ضرورت ہے جنہوں نے"سنیت" کے مسلمہ اصولوں سے منحرف ہو کر اپنا فقہی موقف خود اختراع کیا ہے" مفتی رضا انصاری فرنگی محلی نے اس باب میں فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ " شدت اس دور کی ضرورت تھی اگر فاضل بریلوی ایسی شدت اختیار نہ کرتے تو مسلک اہلسنت میں دراڑ پڑ جاتی ۔ چنانچہ ان کا شدید ہوجانا وقت کا تقاضا تھا ۔ دوراندیشی کی دلیل تھی ۔ مگر آج دین کی تبلیغ و اشاعت اور اصلاح اعمال کے لئے بنیادی شرط اخلاق ہے ۔ نرم روی ہے۔ حسن سلوک ہے۔ علماء کی سخت گیری سے عوام بہت جلد دل برداشتہ ہوجاتے ہیں کیونکہ گزشتہ ایک صدی کے دوران علماء کے طرز عمل کے بارے میں جو منفی پروپگنڈہ کیا گیا ہے اس نے عوام کے اذہان کو علما کی جانب سے پراگندہ کر دیا ہے ۔ ان کے اندر علماء سے ایک خاموش مخاصمت کو فروغ ملا ہے اس لئے فی زمانہ علماء کی ذمہ داریاں دوہری ہوگئی ہیں ۔ ایک طرف ان کو اپنے خلاف کئے گئے منفی پروپگنڈہ کے اثرات کا ازالہ کرنا ہوگا تو دوسری طرف اصلاحِ اعمال پر غور کرنا ہوگا ۔ مذہب کے حوالے سے عوام نرمی ، سادگی اور کسر نفسی کے خواہاں رہتے ہیں اور جب یہ اوصاف ان کو علماء کے ہاں نہیں ملتے ہیں تو وہ ایسے پیروں اور فقیروں سے قرب اختیار کرنے لگتے ہیں جو علوم دینیہ میں خام اور اتباعِ شریعت میں ناقص ہیں ۔ اس طرح برائی مزید عام ہورہی ہے اور برائی کے اس فروغ کو صرف علماء کا حسن اخلاق ہی روک سکتا ہے"۔

مفتی رضا انصاری فرنگی محلی نے معاملات طریقت کے بارے میں میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ " ابھی ایک صدی قبل تک

سجادگی کا معیار عرفان علم، پابندی شریعت اور للہیت تھی۔ حسن اخلاق، نرم خوی، انکساری اور سادگی تھی اس لئے آپ کو حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ شاہ محمد حسین الہٰ آبادیؒ، شاہ محمد فاخر الہٰ آبادیؒ مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلویؒ، پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوریؒ اور پیر امین الحسنات مانکی شریفؒ جیسے شیوخ اور پیران طریقت نظر آتے ہیں جن کے علم وعرفان کا ایک زمانہ معتقد و مداح تھا لیکن تقسیم ہند کے بعد آنکھیں ایسے افراد کے دیکھنے کو ترس گئیں۔ اگر کچھ بندگانِ خدا ہیں بھی تو انہوں نے اس کاروباری فضا سے تارک ہو کر خود کو اسقدر گوشہ نشین کرلیا ہے کہ ان کی بازیابی امر محال ہوگئی ہے۔ اب خانقاہوں میں کاروبار ہورہا ہے جائیدادوں اور آسائشوں پر توجہ دی جانے لگی ہے۔ خوف خدا جاتا رہا۔ نتیجہ یہ کہ ان خانقاہوں کے سجادگان کے قلب بے نور اور زبان بے تاثیر ہوگئی ہے اور عوام اُس روحانی رہنمائی سے محروم ہوگئے ہیں جس کی ہر دور میں ضرورت بہر حال رہتی ہے

رام پور کی ان ابتدائی ملاقاتوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ مولانا نہ صرف ایک درد مند دل رکھتے ہیں بلکہ ان پر طریقت کا شدید غلبہ ہے۔ وہ شریعت کے نفاذ کے لئے طریقت کو بنیاد تصور کرتے ہیں۔ وہ کسی کی دلآزاری نہیں چاہتے کیونکہ ان کی نظر میں دعوت و تبلیغ کے لئے دوسروں کی دلآزاری سب سے بڑا نقص ہے۔ دراصل مولانا رضا انصاری فرنگی محلی نے شریعت اور طریقت کے معاملات کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو ان کا خانوادہ ہمہ آفتاب تھا۔ مفتی عبدالقادر فرنگی

محلیؒ ، مفتی عنایت اللہ فرنگی محلیؒ ، مولانا محمد قطب الدین فرنگی محلیؒ ، مولانا محمد صبغت اللہ شہید فرنگی محلیؒ اور مولانا محمد مہدی فرنگی محلیؒ جیسے علمائے دین اور شیوخِ طریقت موجود تھے ۔ پھر مفتی رضا انصاری کے والد مولوی محمد سخاوت اللہ فرنگی محلیؒ خود بڑے صاحبِ علم و فضل تھے چنانچہ مفتی رضا انصاری کے اندر ایک باطنی ٹھراوَ آگیا تھا ۔ ایسا ٹھراوَ جوارتفاعِ ذات کا وسیلہ ہوتا ہے

بحوالہ تاریخ فرنگی محل کے علماء کا خانوادہ گزشتہ تین سو سال تک برصغیر میں علم و عرفان کی شمع روشن کیے رہا۔ اس خاندان میں علم کی دولت جس طرح محفوظ رہی اور نسلاً بعد نسلاً اس میں جس قدر اضافہ ہوا اس کی ہندوستان کے دیگر علمی خانوادوں میں ذرا کم ہی مثال ملتی ہے ۔ ملا قطب الدین شہید سہالویؒ ، استادالہند ملا نظام الدین فرنگی محلیؒ ، ملا حیدرؒ ، ملا مبینؒ ، ملا حسنؒ ، مولانا عبدالعلی بحرالعلومؒ ، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ ، اور مولانا عبدلباری فرنگی محلیؒ جیسے علماء اس خانوادے کا طرۂ امتیاز ہیں ۔ علامہ شبلی نعمانی نے تقریباً ایک صدی قبل فرنگی محل کے علماء کے بارے میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "فرنگی محل علم و فن کا معدن رہا ہے ۔ آج جہاں بھی علوم عربیہ کا نام ونشان باقی ہے اس خاندان کا پرتوِ فیض ہے ہندوستان کے کسی گوشے میں جو شخص تحصیلِ علم کا احرام باندھتا ہے اس کا رُخ فرنگی محل کی طرف ہوتا ہے " مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی اس خانوادہ کے آخری علمی وارث تھے۔ ان کی رسم بسم اللہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے پڑھائی ۔ پھر خاندانی روایت کے مطابق پہلے حفظ قران کی نعمت سے سرفراز ہوئے ۔ معقولات اور منقولات کا علم مفتی محمد عنایت اللہ فرنگی محلی ، مولانا محمد قطب الدین فرنگی محلی ، مولانا محمد صبغت اللہ شہید فرنگی محلی ، مولانا سید علی زینبی ، مولانا سید علی نقی مجتہد اور ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی کاکوروی سے

حاصل کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے اردو ادب میں اور پنجاب یونیورسٹی سے عربی ادب میں ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔ شعرو ادب سے فطری لگاؤ تھا اس لئے لکھنؤ کے ادبا،اور شعراء کی صحبتوں میں بیٹھے اور ان سے استفادہ کیا۔ اس دور میں لکھنؤ میں صاحبان کمال جمع تھے۔ سید جالب دہلوی ، علامہ نیاز فتح پوری ، حامد اللہ افسر ، مولانا وصل بلگرامی ، آرزو لکھنوی ، مولانا عبدالباری آسی ، صفی لکھنوی ، سراج لکھنوی ، عزیز لکھنوی ، ثاقب لکھنوی ، پرفیسر مسعود حسن ادیب ، مرزا محمد عسکری ، خواجہ عبدالرؤف عشرت، خواجہ عزیزالحسن مجذوب غوری ، پنڈت آنند نرائن ملا، سید آل رضا ، سید علی عباس حسینی ، حیات اللہ انصاری اور جعفر علی خاں اثر جیسے لوگوں سے مولانا رضا انصاری کی راہ و رسم رہی۔ نتیجہ یہ کہ ادبی حلقوں میں وہ جلد پہچانے جانے لگے۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز پر انہوں نے اس تحریک کی نہ صرف تائید و حمایت کی بلکہ ۱۹۳۸ء میں جب لکھنؤ سے اس تحریک کا ترجمان رسالہ " نیاادب " شائع ہوا تو اس کی مجلس ادارت میں سید سبط حسن ، مجاز لکھنوی اور علی سردار جعفری کے ساتھ مفتی رضا انصاری فرنگی محلی بھی شریک تھے۔ ۱۹۴۳ء میں انہوں نے فرنگی محل سے ہی ایک رسالہ "منزل " کے نام سے جاری کیا جو بہت جلد اردو کے نمائندہ ادبی رسائل میں شمار ہونے لگا تھا۔

مولانا رضا انصاری نے اس دوران خود کو ادب تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ وہ فرنگی محل میں درس وتدریس سے بھی وابستہ رہے۔ سیاست سے ان کو بظاہر کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ صحافت سے غیر معمولی شغف پیدا ہوگیا تھا لہذا ۱۹۴۶ء میں وہ روزنامہ ہمدم سے بحثیت رپورٹر منسلک ہوگئے۔ جس کے ایڈیٹر خانوادہ فرنگی محل کے ہی ایک رکن رکین حبیب انصاری تھے۔ مولانا رضا انصاری فرنگی محلی نے اس اخبار میں نہ صرف صحافت کا بنیادی تجربہ

حاصل کیا بلکہ اس دوران ان کو اس وقت کے سیاسی مشاہیر سے بھی ملاقات
کے مواقع میسر آئے ۔ اگرچہ روزنامہ ہمدم آل انڈیا مسلم لیگ کے حامی
اخبارات میں ہوتا تھا لیکن مولانا رضا انصاری فرنگی محلی نے ہمیشہ ایک غیر
جانب دار صحافی کی حیثیت سے معلات و مسائل کا جائزہ لیا ۔ ۱۹۴۸ء میں وہ
لکھنؤ کے ہی ایک اور اخبار رونامہ "قومی آواز" سے وابستہ ہوگئے ۔ اس اخبار
سے مولانا تقریباً بائیس سال وابستہ رہے ۔ صحافت کی ہمہ اوقات مصروفیات
کے باوجود ادب اور مذہب سے تعلق اپنی جگہ برقرار رہا ۔ ۱۹۴۹ء میں انہوں
نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "الادب الجاہلی" کا اردو ترجمہ کیا جو "ادب جاہلی"
کے نام سے شائع ہوا ۔ ۱۹۵۷ء میں ان کی کتاب "مجذوب اور انکا کلام" شائع
ہوئی جس کو اہل علم میں بڑی پزیرائی ہوئی ۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے مفتی
عبدالقادر فرنگی محلی کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ "فتاویٰ فرنگی محل" کے نام سے
مرتب کیا ۔ اسی سال آپ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور واپسی پر
سفرنامۂ حج تحریر کیا ۔ نہایت دلنشین اور پر تاثیر سفرنامہ ۔ یہ سفرنامہ روزنامہ
"قومی آواز" میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا ۔

۱۹۷۰ء کے اوائل میں مولانا کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دینیات کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ مسلم یونیورسٹی کے علمی ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور مولانا سنجیدہ علمی کاموں میں مصروف ہوگئے۔ انہوں نے اپنے خانوادے کے معروف عالم ملا نظام الدین محمد بانیٔ درس نظامیہ پر ایک طویل مقالہ لکھنا شروع کیا جو ماہنامہ "معارف اعظم" گڑھ میں جولائی ۱۹۷۰ء سے مارچ ۱۹۷۱ء تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ مقالے کی تکمیل کے بعد مولانا نے اس پر نظر ثانی شروع کی اور ۱۹۷۳ میں اسے "بانیٔ درس نظامی" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ کتاب مولانا رضا انصاری فرنگی محلی کی تحقیقی کاوشوں اور دیدہ ریزی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں اپنے خاندانی دستاویزات، یادداشتوں اور مخطوطات کے علاوہ دیگر مطبوعہ و غیر مطبوعہ ماخذ سے بھی مدد لی۔ اس موضوع پر اردو میں پہلے ایسی کوئی مفصل اور مدلل کتاب نہیں تھی۔ بعض کتابوں میں فرنگی محل کے نامور علماء کے حالات جزوی طور پر ملتے تھے لیکن وہ اتنے مفصل نہیں تھے کہ ان کی بنیاد پر ملا نظام الدین کی خدمات کا مکمل احاطہ کیا جاسکے۔ مولانا نے اس مصلح درس نظامی کی سیرت نگاری کا بیڑا اٹھا کر نہ صرف اپنے خانوادے بلکہ اہل علم پر احسان کیا۔ بقول ڈاکٹر مختار الدین آرزو "اگر مفتی رضا انصاری فرنگی محلی اس جانب توجہ نہ دیتے تو شاید یہ کام اس خوبی سے انجام نہ پاتا کیونکہ مفتی صاحبکے ساتھ اس کتاب کی تالیف میں ان کی خاندانی اور روحانی قوت بھی کارفرما تھی۔"

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک اگر علماء کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں جن علماء نے ردِّ وہابیہ میں حصہ لیا ان کو بعد کے مورخین نے جن میں سے بیشتر کا تعلق علی گڑھ ۔ دیوبند اور ندوہ سے تھا یا تو نظر انداز کر دیا یا پھر ان کی خدمات کے اعتراف میں وسیع القلبی کا مظاہرہ نہیں کیا جس کی بنا پر یہ علماء خانۂ گمنامی میں چلے گئے اور ان کے ذکر و اذکار سے بیشتر کتابیں خالی رہ گئیں ۔ ان مورخین کو اگر کوئی عالم ناگزیر نظر آیا تو انہوں نے کوشش کی کہ اس کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے تاکہ اس کی شخصیت مشکوک ہوجائے ۔ جیسا کہ مولانا عبدالحئی رائے بریلوی کی کتاب 'نزہتہ الخواطر" سے ظاہر ہے جس کا تکملہ ان کے صاحبزادے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کیا ہے ۔ خصوصاً اس کتاب کی آٹھویں جلد میں اپنے نقطۂ نظر کے مخالف علماء کے بیان میں ان کا قلم بے نیام رہا ہے ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ایک مکتبہ فکر دوسرے مکتبہ فکر کو زندہ رہنے اور اپنی بات کہنے کا حق بھی نہیں دینا چاہتا جس کی بنا پر مورخین طبقات میں بٹ گئے ہیں اور ایک نے دوسرے کا تذکرہ کرنا تو درکنار نام لینا تک گوارا نہیں کیا۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران تحریر کی جانے والی تاریخ کی اکثر کتابوں میں مسخ شدہ حقائق کی بھر مار ہے جبکہ اصل ماخذ کچھ اور ہی بتاتے ہیں ۔ مولانا رضا انصاری فرنگی محلی کو بھی اس صورت حال کا نہ صرف احساس تھا بلکہ وہ اس کے تدارک کے لئے کوشاں رہتے تھے ۔ رام پور میں دوران گفتگو انہوں نے مجھ سے فرمایا "فرنگی محل کے علماء نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی سرپرستی میں پہلی مرتبہ ہندوستان کی سیاست میں عملی حصہ لیا۔ اس سے قبل اس خانوادے نے صرف درس و

تدریس کو اپنا امتیاز رکھا۔ تقسیم ہند سے پہلے کے ہندوستان میں بعض فقہی امور پر علماء کے مابین جو اختلافات رونما ہوئے ان میں بھی فرنگی محل کے علماء نے کسی شدت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہاں جو بات حق نظر آئی وہاں اپنی رائے کا کھل کر اظہار کیا جیسا کہ تقلید کے مسئلے پر مولانا عبدالحئی فرنگی محلی اور مفتی عبدالقادر فرنگی محلی کے فتاویٰ اور تصانیف سے ظاہر ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ان کا موقف انُ علماء کی تائید میں چلا گیا جو ردِّ وہابیہ میں اعلانیہ متشدد تھے۔ فرنگی محل کے علماء نے ہمیشہ فلاح دین کو پیش نظر رکھا اسی لئے وہ غیر ضروری طو پر فروعی اختلافات میں نہیں الجھے لیکن اس کے باوجودان کے تذکرہ میں بعض متعصب مورخین نے فراغ دلی کا ثبوت نہیں دیا۔" مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستگی کے دوران مولانا رضا انصاری فرنگی محلی نے اپنے خانوادے کے دیگر علماء پر بھی تحقیقی مقالے لکھے جو "معارف" اور دیگر علمی جرائد میں شائع ہوئے۔ خصوصاً مولانا محمد یوسف فرنگی محلی اور "علماء فرنگی محلی کے شجرہ نسب پر ایک نظر" کو علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

علماء فرنگی محل کی تین سوسالہ تاریخ کا آغاز اگرچہ استادالهند ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی اور ان کے مرتبہ درس نظامی سے ہوا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خاندان کی علمی سربلندی اور تدریسی سربراہی کا سرچشمہ حضرت سید عبدالرزاق بانسوی علیہ رحمہ کے آستانے سے پھوٹا تھا۔ جو سترھویں صدی ہجری میں بارہ بنکی کے قریب "بانسہ" میں مقیم تھے اور سلسلہ قادریہ کے عظیم بزرگ گزرے ہیں۔ مفتی رضا انصاری نے لکھا ہے کہ "تاریخ کے عجائب و نوادر کی کوئی بڑی چھوٹی فہرست جب بھی مرتب کی جائے گی اس میں اس تاریخی حقیقت کو ضرور جگہ ملے گی کہ اُمی لقب صلی اللہ علیہ وسلم کے

ایک امی فرزند نے اپنے عہد کے عظیم حکماء، علماء اور دانشوروں کو جن کے فضل و کمال پر زمانہ نازاں تھا اس درجہ اپنے ارشاد و عرفان کا محتاج بنادیا کہ وہ نہ صرف معترف و معتقد ہوئے بلکہ زمرۂ غلامی میں منسلک ہوجانا انہوں نے اپنے علم کا حاصل سمجھا اور اس وابستگی کو فوز مبین قرار دیا"۔ مفتی رضا انصاری کو شدت سے یہ احساس تھا کہ مسند تاریخ پر فائز افراد نے علماء فرنگی محل کو ہی نہیں بلکہ اس خانوادے کی روحانی عقیدت کے مرکز حضرت سید عبدالرزاق بانسوی کو بھی نظرانداز کیا ہے چنانچہ انہوں نے اس صورت حال پر اپنے رنج کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔ " تاریخ رزم کی ہو یا بزم کی سامنے کی چیزوں پر ہی اکتفا کرلیتی ہے پسِ پردہ سے دلچسپی کم لیتی ہے "۔ مولانا رضا انصاری نے علامہ شبلی نعمانی کے ایک مقالے " درس نظامیہ " کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "جب ۱۹۱۰ء میں شبلی نعمانی نے اپنے مطالعہ کا نچوڑ خاندان فرنگی محلی کے مورث اعلیٰ ملّا قطب الدین سہالوی کے ذکر میں ان الفاظ میں پیش کیا کہ " تمام ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام میں یہ بات صرف اسی مقدس ذات ملا قطب الدین شہید سہالوی کو حاصل ہے کہ پورے دوسو برس تک متواتر اور بلا فصل ان کی نسل سے علماء ہوتے چلے آرہے ہیں "۔ تو علامہ شبلی نے خود کو مورخ کی حد تک رکھا۔ اس عدیم النظیر علمی سیادت کا ذکر چھیڑتے ہوئے کسی دقیق النظر مورخ کا اس آستانے کی طرف جہاں علمی سیادت کا تاج پہنے علماء اور دانشور جبین عقیدت جھکائے نظر آتے ہیں التفات نہ کرنا بجائے خود موجب تعجب ہے۔ عقیدت کی بنا پر نہ سہی محض تاریخی ندرت کے سبب یہ حوالہ ازبس ضروری تھا جیسا کہ مرزا قتیل نے" ہفت تماشا " میں ملا نظام الدین فرنگی محلی اور ملا کمال الدین سہالوی کے ضمن میں دیا ہے۔ کسی سے منوانے یا کسی پر مسلط کرنے کی خواہش کے بغیر اپنے اور اپنے اسلاف کے

اس ادعان کے اظہار میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ علماء فرنگی محل کی کوئی تاریخ اس وقت تک مکمل تاریخ نہیں بن سکتی جب تک ان علماء کرام کی آستانہ عالیہ قادریہ حضرت بانسہ سے وابستگی کے پس منظر میں اسے دیکھا نہیں جاتا"۔ مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کی " آستانہ عالیہ قادریہ رزاقیہ " سے والہانہ عقیدت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ خود بھی اسی سلسلہ میں داخل تھے ۔ ان کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے جو سلسلہ قادریہ رزاقیہ کے فرنگی محل میں آخری بڑے شیخ ثابت ہوئے مولانا کے انتقال سے چار گھنٹے قبل بیعت کروایاگیا اور بعد میں اس سلسلہ میں انکو تقریباً چالیس سال کے بعد بیعت کی اجازت ان کے استاد اور چچا مولانا مفتی حافظ محمد شفیع حجت اللہ انصاری نے دی جو حضرت مولانا عبدالباری کے مرید و خلیفہ اور شاگرد تھے مفتی محمد رضا انصاری کو اپنے سلسلۂ سلوک پر بے پناہ ناز تھا اور اسی ناز نے ان کو آمادہ کیا کہ وہ حضرت سید عبدالرزاق بانسوی کے ذکر و احوال میں ایک علحدہ کتاب تحریر کریں۔

مفتی رضا انصاری نے اپریل ۱۹۸۵ء میں عمرہ کی ادائیگی سے واپسی پر اس کام کا آغاز کیا اور دو سال کی شبانہ روز محنت سے اسے مکمل کردیا۔ یہ وہ دور ہے جب علی گڑھ سے ۱۹۸۱ء میں فارغ ہونے کے بعد مفتی صاحب لکھنؤ آگئے تھے اور اردو اکادمی یوپی کے چیئرمین کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ " تذکرہ حضرت سیّد صاحب بانسوی " کو نہ صرف اہل علم نے بھارت میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا بلکہ پاکستان میں بھی ادارہ تحقیقاتِ افکار و تحریکات ملی نے اس کا پاکستانی اڈیشن شائع کیا۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے پاکستانی ایڈیشن کے آغاز پر اپنے پیش لفظ میں تصوف اور تصوف سے متعلق لٹریچر کی ضرورت اور اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا کہ "

اردو ادب میں ایسے لٹریچر کی تلاش کی جائے تو جو چند چیزیں دستیاب ہوں گی ان میں مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کی یہ تالیف " تذکرہ حضرت سیّد عبدالرزاق صاحب بانسوی " کیا بالحاظِ سوانح اور افکار و افادات صاحبِ تذکرہ اور کیا بالحاظِ حسن تالیف اور خوبیٔ اسلوب و نگارش نمایاں مقام کی حامل ہے۔ "

" تذکرہ حضرت سیّد صاحب بانسوی " کی اشاعت کے بعد مفتی محمد رضا فرنگی محلی ۱۹۸۸ء میں پاکستان تشریف لائے۔ پتہ چلا کہ مفتی صاحب کا قیام ڈیفنس سوسائٹی میں اپنی چھوٹی ہمشیرہ کے گھر ہے۔ محمد واقف علوی بہنوئی ہیں۔ میں شام کو علوی صاحب کے ہاں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کسی کے ہمراہ جمال میاں فرنگی محلی کے ہاں گئے ہوئے ہیں اور واپسی کے وقت کا کوئی علم نہیں۔ میں " تذکرہ محدث سورتی " کا ایک نسخہ مفتی صاحب کو پیش کرنے کے لئے ساتھ لے گیا تھا۔ اس وقت یہی مناسب معلوم ہوا کہ میں یہ نسخہ اور اپنا تعارفی کارڈ چھوڑ جاؤں۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ اگلے روز میں دفتر میں تھا کہ ٹیلی فون آپریٹر نے بتایا " مفتی رضا انصاری فرنگی محلی بات کرنا چاہتے ہیں " میں نے ریسور اٹھایا تو دوسری طرف سے مفتی صاحب بول رہے تھے۔ رسمی سلام دعا کے بعد انھوں نے تذکرہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا " بھئی آپ سے ملاقات بھی ہونا چاہیئے " میں نے فرصت کے اوقات دریافت کئے تو فرمایا " آج بعد ظہر آجاؤ میں منتظر رہوں گا " میں نے فوراً وعدہ کرلیا۔ دوپہر کو حاضر ہوا تو آپ ڈرائنگ روم میں میرے منتظر تھے۔ میں نے نیاز مندانہ مصافحہ کے بعد دست بوسی چاہی تو ہاتھ کھینچ لئے اور فرمانے لگے " میں دست بوسی کو حرام نہیں سمجھتا ہوں۔ یہ ایک فعلِ انکسار و عقیدت ہے اس سے ایمان میں خلل واقع نہیں ہوتا مگر میں نے اس کی اجازت صرف اپنے مریدوں کو دے رکھی ہے۔ آپ تو خود صاحب نسبت ہیں۔

" مفتی صاحب نے یہ کہہ کر مجھے اپنے قریب ہی بٹھالیا اور پھر گفتگو کا سلسلہ چل پڑا۔ اور یہ سلسلہ بھی شروع ہوا " دست بوسی " سے ہی۔ مفتی صاحب نے فرمایا " اب تو مشائخِ دیوبند کے بعض خلفاء بھی دست بوسی کو ناروا تصور نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے مجھ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بادشاہوں، حکام بالا اور سرمایہ داروں کی دست بوسی سے عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی کا اظہار ہوتا ہے لیکن فقیروں اور درویشوں کی دست بوسی انسان کے اندر عجز کو فروغ دیتی ہے۔ انسان کو انسان کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔ غرور و تکبر کو کافور کرتی ہے۔ میں مجمعِ عام میں دست بوسی کا قائل نہیں ہوں۔ کبھی کبھی دوسروں کا بے جا اظہارِ عقیدت بھی انسان کے اندر موجود فرعون کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس لئے دست بوسی سے مجھے خوف آتا ہے۔ " مفتی صاحب نے فرمایا ہمارے خانوادے کے علماء کا رویہ ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا ہے۔ انھوں نے دائرہ شریعت میں رہتے ہوئے عصری تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ علماء اور عوام کے درمیان تفہیمی فاصلے کم ہو سکیں۔ خصوصاً مولانا عبدالحئی فرنگی محلی جن کا وصال ۳۸ سال کی عمر میں ہو گیا تھا نہایت ترقی پسندانہ روش کے حامل تھے۔ میں نے " مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کا فقہی موقف اور ئے ہندوستان میں اس کی معنویت " کے عنوان سے ایک مضمون ۱۹۷۶ء میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک سیمنار میں پڑھا تھا۔ اس مضمون میں بعض قدیم اختلافی فتاویٰ کے حوالے سے گفتگو کی گئی تھی اور خیال تھا کہ اس پر اعتراضات وارد ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہر شخص نے تعریف کی۔ خصوصاً مولانا سیّد صباح الدین عبدالرحمان اور ڈاکٹر مشیر الحق نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ماضی قریب کے علماء ہند کے فتاویٰ سے اجتہادی

نوعیت کے فتاویٰ کو یکجا کر کے پیش کیا جائے تو عوام کی نظروں میں علماء کا وقار بلند ہو گا کیونکہ فی زمانہ فتاویٰ کو جدید تعلیم یافتہ عوام میں اختلافی اور غیر ضروری مباحث کا مجموعہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح دور جدید میں فقہ کی اہمیت بھی اجاگر ہو گی۔

مولانا رضا انصاری فرنگی محلی نے مزید کہا کہ " فتاویٰ کے سلسلہ میں عام اصول یہ ہے کہ کسی مباح یا جائز بات کو اگر کسی عہد یا زمانہ میں کسی فقیہ نے ممنوع قرار دیا ہے تو وہ برابر ممنوع ہی رہے گی۔ ایسی متعدد مثالیں ہماری کتب فقہ میں موجود ہیں بلکہ بسا اوقات یہ ممانعت سند اور نص کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ یہ ایک ایسی روایت تھی جو ہندوستان میں مروج تھی لیکن ۱۸۵۷ کے بعد کے ہندوستان میں عصری تقاضوں کے پیشِ نظر مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے اس روایت کے برعکس موقف اختیار کیا۔ انھوں نے مسائل کو عصری تناظر میں دیکھ کر ایسی ممانعت کو ہنگامی اور وقتی ٹھہرایا اور ہمیشہ اس اصول کو پیش نظر رکھا کہ " اصل ہر شے میں حلّت ہے " مفتی صاحب نے کہا کہ اگر ہم مصلحین کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم کو متعدد ایسی شخصیات مل جائیں گی جن کو ان کی اجتہادی فکر کی بنا پر عوام و خواص کے غم و غصہ کا شکار ہونا پڑا مگر وہ اپنے موقف پر قائم رہے اور بعد میں وقت نے ثابت کر دیا کہ ان کا ہی موقف درست تھا جیسا کہ مولانا احمد رضا خان فاضلِ بریلوی کے ایک فتوے سے ثابت ہے۔ فاضلِ بریلوی نے ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات کے دوران جب ہندوؤں سے بھی تعاون کو ممنوع قرار دیا تو ہندوستان کی قوم پرست فضاء میں زلزلہ آگیا۔ ان کے موقف کو انگریزوں کی حمایت قرار دیا گیا مگر بعد میں رونما ہونے والے حالات و واقعات نے فاضلِ بریلوی کے موقف کی توثیق کر دی۔ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کو بھی ۱۸۷۶ء میں ایک ایسے

ہی مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ بمبئی سے ان کے پاس ایک استفتاء آیا جس میں دریافت کیا گیا تھا کہ " عورتوں کو لکھنا سکھانا جائز ہے یا نہیں۔ " مولانا نے اسے جائز قرار دیا جس پر دیگر علماء کی جانب سے دیئے گئے عدم جواز کے فتاویٰ کی روشنی میں دوبارہ سوال کیا گیا مگر آپ نے اپنے سابقہ موقف پر قائم رہتے ہوئے تحریر فرمایا " عوام کے ذہنوں میں یہ الجھن ہے کہ چونکہ عورتوں کو لکھنا سکھانا خرابیوں کی طرف لے جاتا ہے اس لئے یہ امر مکروہ ہے مگر میں کہتا ہوں کہ کسی جائز بات سے خرابی پیدا ہونے کا امکان اس جائز بات سے کراہت کا باعث نہیں ہوا کرتا۔ ہاں اگر کوئی جائز بات عموماً خرابیوں کی طرف لے جاتی ہو تو اسے خرابیوں کو روکنے کے نقطۂ نظر سے ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ " مولانا عبدالحئی کے اس جواب پر عوام اور علماء میں خاصا اشتعال پیدا ہوا۔ ان کے خلاف رسائل لکھے گئے۔ بُرا بھلا کہا گیا مگر انھوں نے اپنے موقف سے رجوع نہیں کیا یہاں تک کہ بیسویں صدی کے آغاز پر ہندوستان میں مسلمان عورتوں کے درمیان تعلیم اس قدر عام ہونے لگی کہ تعلیم نسواں کی باقاعدہ تحریکیں شروع ہو گئیں۔ مولانا رضا انصاری نے مزید کہا کہ آج جو جدید تعلیم یافتہ خواتین علماء کرام کو اپنا دشمن تصور کرتی ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ علماء میں سے ہی ایک شخص ان کا اولین محسن تھا۔ مگر یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی خواتین کی تعلیم کے حق میں تھے اور تعلیم سے ان کی مراد تعلیم تھی۔ تعلیم کے پردے میں موجودہ بے حیائی اور بے پردگی کے یقیناً وہ بھی خلاف تھے۔

مولانا رضا انصاری فرنگی محلی کو چونکہ اپنے خانوادے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی اس لئے میں نے ادب کے حوالے سے کچھ گفتگو کرنا چاہی مگر انھوں نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ مجھے احساس

ہوا کہ اس وقت مفتی صاحب نہیں بلکہ ان کا لہو بول رہا تھا۔ شجرۂ نسب کی توانائی بول رہی تھی۔ وہ غصہ بول رہا تھا جو ان کے خانوادے کے علماء کی خدمات کو پس پشت ڈالنے کی مسلسل سازشوں کی بناء پر ان کے رگ و پے میں اتر آیا تھا۔ مفتی صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا " فتاویٰ میں تاریخِ اسلام سے استناد کم ملتا ہے۔ ایک فقیہ صرف کتب فقہ تک خود کو محدود رکھتا ہے اور تاریخ سے اپنی ناواقفیت کی سزا دوسروں دیتا رہتا ہے جب کہ تاریخ مستقبل کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کے فقہی موقف کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ تاریخ اسلام سے ثبوت و سند پیش کرتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کو روشنی دکھانے کا فریضہ انجام دیا۔ مولانا عبدالحیٔ کا یہ انداز علم فقہ میں نادر ہے اور اس سے ہم مولانا کی باطنی بصیرت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالحیٔ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ جو مفتی عباراتِ کتب اور مجتہدین کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہے اور استنباطِ مسائل کی مطلقاً صلاحیت نہیں رکھتا وہ ناقل تو ہوسکتا ہے مفتی نہیں۔ مولانا رضا انصاری نے کہا کہ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے اس زمانہ میں انگریزی پڑھنے کے بارے میں جواز پیش کیا جب ہندوستان کے بیشتر مراکز افتاء اس کے جواز کے قائل نہیں تھے۔ یہ ایک ترقی پسندانہ رویہ تھا جس کی آج بھی مفتیانِ کرام کے یہاں کمی نظر آتی ہے۔

اس روز شام تک مفتی رضا انصاری اپنے خانوادے کے حوالے سے ہی گفتگو کرتے رہے اور اس بات کا ان کو بھی احساس تھا چنانچہ جب میں نے رخصت چاہی تو فرمانے لگے " میاں آپ سے میں نے یہ گفتگو اس لئے کی کہ آپ نہ صرف تاریخ کے طالب علم ہیں بلکہ آپ کو علماء کی تاریخ سے بھی

دلچسپی ہے۔ ادب کے حوالے سے تو بہت سے لوگوں سے ملاقات بھی ہو گی اور گفتگو بھی لیکن ان موضوعات پر بات چیت کے لئے کم لوگ ملتے ہیں۔ کل صبح میری مشفق خواجہ صاحب سے ملاقات ہے دوپہر فارغ ہوں اگر موقع ملے تو ٹیلی فون کر لیجیئے گا۔ مزید گفتگو ہو گی۔" میں وعدہ کر کے رخصت ہو گیا لیکن راستے بھر سوچتا رہا کہ مفتی صاحب نے اپنے خانوادے کے حوالے سے اتنی گفتگو کیوں کی۔ ابتداً یہ گمان ہوا کہ شاید وہ احساس برتری کا شکار ہیں لیکن کافی غور و خوض کے بعد عقدہ کھلا کہ انھوں نے یہ گفتگو اپنے احساس تنہائی کے زیرِ اثر کی تھی کیونکہ مولانا محمد ہاشم فرنگی محلی کے انتقال کے بعد اپنے خانوادے میں درس وتدریس اور فتویٰ نویسی کی روایت کے صرف وہی امین رہ گئے تھے یعنی ان کو یہ احساس تھا کہ ان کے خانوادے کی تین سو سالہ تاریخ کے آخری معتبر روای صرف وہی ہیں۔ اس لئے وہ اپنے خانوادے کی علمی خدمات کے حوالے سے وہ سب کچھ کہہ دینا چاہتے تھے جو ان کے مشاہدہ اور تجزیہ کا ماحصل تھا۔ بقول سلیم احمد

سب مجھ کو جلا کر سو گئے ہیں
میں ایک چراغِ نیم شب ہوں

۱۹۸۸ء میں مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کا کراچی میں تقریباً دو ہفتہ قیام رہا اور اس دوران میری ان سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ میں اگرچہ اپنے علم اور تجربہ میں بہت خام تھا لیکن انھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔
"تذکرۂ محدث سورتی" کے بارے میں ان کی رائے زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ایک دن فرمانے لگے " آپ نے تذکرہ میں حقائق تو یکجا کر دیئے ہیں لیکن کوئی ایسا تجزیہ پیش نہیں کیا جس سے آپ مخالفین کو اپنا ہم نواء بنا سکتے۔ تذکرہ ہو یا تاریخ اس کے لکھنے والے کا غیر جانبدار ہونا بہت ضروری ہے۔

تاریخ Reporting نہیں Reposing ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہوتی ہے جس میں منظر اور پس منظر دونوں ہی نظر آتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ تاریخ لکھتے وقت معروضیت کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ میں نے "تذکرۂ محدث سورتیؒ" کو ادھر اُدھر سے دیکھا ہے۔ تمھاری محنت تو نمایاں نظر آتی ہے لیکن محدث سورتیؒ کی اپنے عصر میں انفرادیت کے تعین کے لئے جس تقابلی مطالعہ کی ضرورت تھی وہ اس میں نہیں ہے۔ محدث سورتی کا بیسویں صدی کے اہم ترین محدثین میں شمار ہوتا ہے۔ تلامذہ کے حوالے سے بھی اور تصانیف کے حوالے سے بھی۔ خصوصاً ان کی تصانیف ان کے علمی تبحر کی آئینہ دار ہیں اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی تصانیف سے استفادہ کر کے ان کی سوانح مرتب کی جائے تب ان کی شخصیت کے موثر خدو خال نمایاں ہوں گے۔"

ان ہی ملاقاتوں کے دوران ایک دن میں نے مفتی صاحب سے دریافت کیا " حضرت آپ شریعت و طریقت کے نمائندہ ہیں۔ آپ کو تو اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز درس و تدریس سے کرنا چاہیئے تھا۔ ویسے بھی یہ آپ کی خاندانی روایت تھی لیکن آپ نے صحافت کو ترجیح دی اس کی کیا وجوہات تھیں؟ مفتی صاحب کے چہرے پر ایک خوشگوار مسکراہٹ پھیل گئی اور انھوں نے میرا سوال مکمل ہوتے ہی ارشاد فرمایا " تمھارا سوال کسی حد تک درست ہے۔ ہم نے بہت کم عمری میں فراغت حاصل کرلی تھی۔ سند مل جانے سے دورِ طالبِ علمی ختم تو نہیں ہو جاتا۔ چہرہ مہرہ تو ہماری طالبِ علمی کی بہت بعد تک گواہی دیتا رہا۔ اس لئے مسندِ درس پر بیٹھنے کے خیال سے ہی حیا آتی تھی۔ اتنے جیدّ علمائے کرام کی موجودگی میں ہمارے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ خود کو اساتذہ کے زمرے میں شامل کرلیں۔ دوسری بات یہ

تھی کہ شعر و ادب سے دلچسپی کی بناء پر ہمارے دل و دماغ میں ایک ایسی "روشن خیالی" اور "ترقی پسندی" پیدا ہو گئی تھی جو ہمارے اپنے بزرگوں کی نظر میں مناسب نہیں تھی۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز نے تو بڑی حد تک یہ طے کردیا تھا کہ جو ترقی پسند تحریک کی حمایت کرتا ہے وہ مذہب دوست نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ ایک مفروضہ تھا لیکن حالات و واقعات کی روشنی میں اس کی آسانی سے تردید بھی ممکن نہیں تھی۔ یہی روشن خیالی اور ترقی پسندی ہماری صحافت سے وابستگی کا سبب بنی۔ اپنی بات کھل کر کہنے کا پہلے بھی عارضہ تھا اور اب بھی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں اگر آدمی کی نیّت نیک ہو۔"

مفتی صاحب نے مزید کہا کہ "ویسے صحافت ہمارے خانوادے کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ فرنگی محل سے ۱۸۵۶ء میں پہلا اردو اخبار "طلسم لکھنوٴ" نکلا۔ پھر جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے تقریباً تیس سال بعد یعنی ۱۸۸۶ء میں "کارنامہ" شائع ہوا۔ "طلسم لکھنوٴ" میں خبروں کے علاوہ لکھنوٴ کی تہذیب و تمدن پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے جب کہ "کارنامہ" میں زیادہ زور مذہبی اور ادبی امور سے متعلق خبروں پر ہوا کرتا تھا۔ یہ دونوں اخبار کچھ سال تک جاری رہے پھر بند ہو گئے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے روزنامہ "ہمدم" کی سرپرستی فرمائی۔ ۱۹۱۵ء میں فرنگی محل سے ماہنامہ "النظامیہ" شائع ہونا شروع ہوا جس کی سرپرستی میرے والدِ مرحوم و مغفور مولانا سخاوت اللہ فرنگی محلی کرتے تھے۔ ادارت کی ذمہ داریاں ابتداً ان کے برادر خورد مولانا صبغت اللہ شہید فرنگی محلی کے سپرد تھیں لیکن جب وہ بہ سلسلہ ملازمت حیدر آباد دکن چلے گئے تو ان کے عمزاد یعنی مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی کے صاحبزادے مولانا محمد شفیع حجت اللہ انصاری

نے یہ ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اگرچہ اس رسالہ کا مقصد فرنگی محل کے علماء کی عوامی و مذہبی خدمات کو روشناس کرانا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس رسالہ نے اسلام کی ترویج و اشاعت، مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اخوت کے جذبات کے فروغ اور حصولِ علم کی افادیت کے پرچار کا بھی فریضہ انجام دیا۔ "النظامیہ" میں علمی نوعیت کے استفتا اور ان کے جوابات بھی شائع ہوتے تھے۔ بعد میں مسلمانوں کے اندر سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لئے بھی اس رسالے نے مضامین شائع کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فروری ۱۹۱۹ء میں حکومت نے رسالہ پر پابندی عائد کردی۔ مفتی صاحب نے کہا کہ فرنگی محل کا مذہب و سیاست سے ہی نہیں صحافت سے بھی ایک دیرینہ تعلق تھا۔ میں نے جب "ہمدم" سے وابستگی اختیار کی تو اس وقت "ہمدم" کے ایڈیٹر ہمارے ہی خانوادے کے ایک فرد فرید حبیب انصاری تھے۔ اس لئے صحافت سے میری وابستگی خاندانی روایت سے کوئی بغاوت نہیں تھی۔"

اس سے پہلے کہ مفتی صاحب کا حافظہ ان کو کسی اور تفصیل کی طرف لے جاتا میں نے ان سے دوسرا سوال کرلیا "قبلہ یہ صحافت سے وابستگی خاندانی روایت کا اتباع اور شوق کی تکمیل ہی تھی یا پھر اس کا باقاعدہ کوئی مقصد تھا۔" مفتی صاحب مسکرادیئے اور فرمانے لگے "میاں تم بھی صحافی رہ چکے ہو۔ اس لئے یہ بات تو تم کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر صحافت شوق کی تابع بھی ہو تب بھی وہ ایک مرحلہ پر مقصدی ہو جاتی ہے۔ بے مقصد صحافت کی کوئی افادیت ہی نہیں ہوتی۔ ہاں میری نظر میں صحافت کو ضمیر کا تابع ضرور ہونا چاہیئے۔ جہاں صحافت میں ضمیر کار فرما ہوتا ہے وہاں صحافت مشن ہو جاتی ہے ذریعہ معاش نہیں رہتی۔"

ترقی پسند تحریک سے مولانا رضا انصاری فرنگی محلی کی وابستگی ایک

عرصہ تک اکثر حلقوں میں موضوعِ گفتگو بنی رہی۔ ایک عظیم مذہبی خانوادے سے تعلق اور بذاتِ خود عالم ہونے کے باوجود انھوں نے " انجمن ترقی پسند مصنفین " میں نہ صرف شمولیت اختیار کی بلکہ اس کی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے یہ بات جہاں ان کے خانوادے میں باعثِ نزاع تھی وہاں علمی و مذہبی حلقے بھی اس حوالے سے ان کو ہدفِ تنقید بناتے رہتے تھے۔ پاکستان میں بھی مولانا کی اس روش پر حیرت و تعجب کا اظہار کیا جاتا رہا لہٰذا جب ترقی پسند تحریک کا ذکر آیا تو میں نے مفتی صاحب کی بات مکمل ہوتے ہی ان سے اس حوالے سے کچھ سوالات کر ڈالے میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مفتی صاحب نے فرمایا " یہ درست ہے کہ میں ان افراد میں سے ہوں جنھوں نے روزِ اول سے ترقی پسند تحریک کی حمایت کی لیکن یہ بات قطعی غلط ہے کہ میں ادب کے ذریعہ مذہب کی نفی کا بھی قائل تھا۔ دراصل ترقی پسند تحریک ایک ایسی تحریک تھی جس کا مقصد ادب کے ذریعہ سماجی برائیوں کی نشاندہی اور ان کا ازالہ تھا۔ یہ تحریک ایک رضا کارانہ جذبہ کی مرہونِ منت تھی چنانچہ اس سے وابستہ افراد ابتداً بہت بے لوث ہو کر اپنا کام کرتے رہے لیکن جب اس تحریک کو ایک مخصوص " ازم " کے تابع کرنے اور اسے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا رجحان فروغ پانے لگا تو نہ صرف اس کی افادیت متاثر ہوئی بلکہ مقبولیت میں بھی کمی آگئی۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ یہ تحریک شروع سے ہی مذہب کی مخالف تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو منشی پریم چند جیسا ہندو ادیب اور مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالمجید سالک جیسے لوگ اس تحریک کی کبھی تائید نہ کرتے۔ یہ تحریک فی نفسہ ایک مثبت انقلابی رجحان کی تابع تھی جس کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش نے اس کی تنظیمی قوت کو کم کر دیا۔ مفتی رضا انصاری فرنگی محلی نے کہا کہ میں ادب کو

اصلاحِ معاشرہ کے لئے ایک موثر قوت تصور کرتا ہوں۔ اس لئے مجھے ترقی پسند تحریک میں یہ قوت نظر آتی تھی کہ وہ مفسداتِ معاشرہ کے ازالہ میں موثر ثابت ہو گی اور کسی حد تک اس نے اپنا کردار ادا بھی کیا لیکن جب اسے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ اپنا تاثر کھونے لگی۔ میں آج بھی خود کو ترقی پسند تصور کرتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ترقی پسند تحریک کو جن معنیٰ میں روزِ اوّل قبول کیا تھا ان ہی معنیٰ میں آج بھی اس کی افادیت پر یقین رکھتا ہوں۔"

مفتی رضا انصاری نے مزید کہا کہ ویسے اس حقیقت کو فراموش یا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر ترقی پسند تحریک کا آغاز نہ ہوتا تو ہمارا ادب اس قدر تیزی سے بین الاقوامی رویوں سے ہمکنار نہ ہوتا جیسا کہ ترقی پسند تحریک کے بعد ہوا۔ پھر جن افراد نے ترقی پسند تحریک سے انحراف و اختلاف کیا انھوں نے بھی تو ادب ہی تخلیق کیا۔ چاہے وہ کسی بھی "بنیر" کے نیچے کیا ہوں۔ بہرحال ادب کو ہی وسعت حاصل ہوئی۔ آج جدیدیت یا جدید حسیت کی جو بات کی جاتی ہے وہ بھی دراصل ترقی پسند تحریک سے اختلاف کا نتیجہ ہے اس لئے اس تحریک کی افادیت سے انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے اپنے آغاز پر ادب میں پائی جانے والی یکسانیت کو ختم کیا اور غور و فکر کے نئے زاویئے اجاگر کئے۔ یہی ترقی پسند تحریک کی کامیابی تھی۔"

دورانِ گفتگو میں نے مفتی صاحب سے عرض کیا کہ " حضرت مگر کیا وجہ ہے کہ آج بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ افراد کے بارے میں یہی باور کیا جاتا ہے کہ وہ مذہب بیزاری کا شکار ہیں " مفتی رضا انصاری نے کہا کہ ہو سکتا ہے اور ہے بھی کہ کچھ لوگ ترقی پسندی کے نام پر مذہب بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن اس کا ترقی پسندی سے کلّیہ کے طور پر کوئی علاقہ نہیں۔ دراصل

لوگ تاریخ کے تسلسل سے نا آشنا ہیں اس لئے ایسا تصور کرتے ہیں۔ میں ترقی پسندی کو اردو ادب کی تاریخ کے تناظر میں دیکھتا ہوں۔ مجھے ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندوستان میں مولانا الطاف حسین حالی پہلے ترقی پسند نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے مقصدی ادب کا نعرہ لگایا۔ وہ شعر و ادب کو روائتی یکسانیت، فرسودہ خیالی اور تفریحِ محض سے نکال کر بامقصد بنانے کے آرزو مند تھے اور انھوں نے اس کے لئے بنیادیں بھی فراہم کیں۔ یہ مولانا حالی کی ہی ترقی پسندی تھی جس نے ۱۹۳۶ میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی شکل اختیار کرلی۔ دراصل بہت سے لوگ "ترقی پسند رجحان" اور ترقی پسند مصنفین کی "انجمن" کو گڈ مڈ کردیتے ہیں اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک مذہب کی نفی کا نام تھا حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ترقی پسند تحریک ایک "رجحان" تھی اور انجمن ترقی پسند مصنفین ایک "تنظیم" تھی۔ کسی تنظیم میں ایسے لوگ بااختیار ہو سکتے ہیں جو مذہب کی نفی کا جواز لاتے ہوں لیکن کسی رجحان پر ایسا کوئی لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین غیر موثر ہو سکتی ہے لیکن ترقی پسندی کا رجحان جو فطرتِ انسانی سے مشروط ہے ختم نہیں ہو سکتا۔ اگر انجمن ترقی پسند مصنفین میں سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، سبط حسن، اسرار الحق مجاز لکھنوی اور عصمت چغتائی جیسے مذہب بیگانہ افراد موجود تھے تو اسی انجمن میں حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش اور فیض احمد فیض بھی تھے جن کی مذہب دوستی پر کم از کم مجھے تو کوئی شبہ نہیں۔ اور یہ بات میں اس بناء پر کہہ رہا ہوں کہ میں کسی حد تک ان افراد کے نجی معاملات سے واقف ہوں۔

اس مرحلہ پر مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے بھی ہر آدمی کو اگر بالکل مولوی ہی بنادیا گیا تو معاشرے سے ہم جیسے مولویوں کی افادیت ختم ہو

جائے گی۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ آپ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے منشور سے تو اختلاف کر سکتے ہیں ترقی پسند رجحان سے نہیں۔ جب تک آپ ترقی پسند " رجحان " اور " انجمن " میں تفریق نہیں کریں گے آپ ترقی پسندی کے مفہوم و مقاصد سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکیں گے۔

مفتی رضا انصاری فرنگی محلی نے پاکستان کی ادبی صورت حال پر بھی تفصیلی گفتگو کی اور فرمایا کہ " پاکستان میں اردو ادب کے فروغ و ترقی کے مواقع زیادہ ہیں کیونکہ یہاں اردو کو قومی زبان کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن بھارت میں کام زیادہ ہوا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بھارت میں مسابقت کی بناء پر ایسا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ حقیقت ہو لیکن اردو کی ترقی میں بھارت کے ادیبوں اور شاعروں کی سنجیدہ وابستگی کا زیادہ دخل ہے جب کہ پاکستان میں ادب کو فیشن کے طور پر اپنایا بھی گیا اور متعارف بھی کرایا گیا۔ جس کی بناء پر پاکستان میں لکھا جانے والا ادب خصوصاً تنقید، افسانہ اور تحقیق بھارت میں ہونے والے کام کے مقابلے میں نسبتاً کم اور کمزور ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں۔"

مفتی رضا انصاری فرنگی محلی گفتگو میں نہایت طاق تھے۔ مگر کلیہ بنا کر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ موضوع کے حوالے سے اپنی بات اور مافی الضمیر دوسرے تک پہنچا دینا ان کو خوب آتا تھا۔ ان کی گفتگو میں " مولویانہ " تکلف نہیں تھا اور وہ گفتگو کے دوران نہ ہی کسی موضوعاتی ربط کی تلاش میں الفاظ کو چباتے تھے۔ ابہام سے پاک صاف ستھرا لہجہ کبھی کبھی اسی لہجہ میں تندی بھی آجاتی تھی۔ جس کو وہ خود بھی محسوس کرلیتے تھے اور فوراً ہی معذرت خواہانہ لہجے میں اسی بات کو نہایت دھیمے انداز میں دھرا دیتے۔ مگر موقف میں کوئی لچک نہیں آنے دیتے تھے۔ ان کی صحبت میں ایک عجیب

سرمستی اور سرشاری تھی۔ دل چاہتا تھا کہ وہ گفتگو کا سلسلہ ختم نہ کریں۔ بس بولے جائیں۔ اب ایسے لوگ کہاں نصیب ہوتے ہیں جو معلومات کے حوالے سے اپنا سینہ کھول کر مخاطب کے سامنے رکھ دیں۔ ۱۹۸۹ء میں مفتی صاحب پاکستان آئے تو انھوں نے از خود رابطہ کر کے مجھ کو اپنی آمد کی اطلاع دی اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اس مرتبہ بھی مفتی صاحب سے میری مختلف موضوعات پر گفتگو رہی۔ میں نے ان کے ساتھ متعدد تقریبات میں شرکت کی۔ خود سے ہی نہیں دوسروں سے بھی ان کو گفتگو کرتے سنا۔ ان کے لب و لہجہ کی مٹھاس کو محسوس کیا۔ ان کو دوسروں کی دلجوئی اور دوسروں کو ان کا احترام کرتے دیکھا۔ خاندانی روایات، علوئے نسب اور اودھ کی تہذیب کا ان کے ہر انداز و ادا سے ترشح ہوتا تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ ایک بڑے آدمی نظر آئے۔ ایسے بڑے آدمی جنھوں نے زندگی کے کسی لمحہ میں بھی بڑا آدمی بننے کا کوئی خواب نہیں دیکھا۔ اس لئے ان کی فکر سے تعبیر کا کوئی آزار پیوست نہیں تھا۔ بس بڑائی ہی بڑائی تھی۔ غرور و نخوت سے بے نیاز بڑائی۔ ایسی بڑائی جس میں فخر و مباہ کے عکس لہراتے رہتے تھے۔ مجھے علماء کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں جہاں اکثر علماء کا حد درجہ احترام کرتا ہوں وہاں کچھ ایسے بھی ہیں جن کی کسی محفل میں موجودگی بھی میرے اعصاب پر گراں گزرتی ہے۔ ایسے ہی علماء کے ضمن میں کسی نے کہا تھا کہ "فی زمانہ عالم وہ ہے جس کو اپنی دنیا اور دوسرے کی عاقبت عزیز ہو" مگر مفتی صاحب کے ہاں دنیا کہیں تھی ہی نہیں۔ عاقبت ہی عاقبت تھی۔ درویشی اور بے نیازی ان کے خمیر اور ضمیر کا جزوِ اعظم تھی اور اسی جزوِ اعظم نے ان کو سلف صالحین کی یادگار بنادیا تھا۔ ۱۹۸۹ء میں مفتی صاحب جب پاکستان سے رخصت ہوئے تو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس عالمِ

آب و گلِ میں چند مہینوں کے مہمان ہیں۔ ان کی زندگی کا چراغ بجھنے والا ہے اور موت کے قدموں کی چاپ ان کے درِ حیات سے قرب اختیار کرتی جارہی ہے۔

۷ فروری ۱۹۹۰ء کی صبح جب میں نے روزنامہ جنگ دیکھا تو مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کے انتقال کی خبر آنکھوں کے سامنے تھی۔ ۵ فروی ۱۹۹۰ کو لکھنؤ میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ میں نے بجھی ہوئی آنکھوں سے خبر پڑھی اور زبان سے بے اختیار نکلا

ایک لمحہ کا سفر ہے زندگی
اپنے منظر سے پس منظر کی طرف

مولانا رضا انصاری فرنگی محلی کا انتقال تمام اہل علم کے لئے ایک عظیم سانحہ تھا۔ یوپی، سی پی کے شہروں خصوصاً لکھنؤ، علی گڑھ، حیدر آباد دکن، مدارس، بنگلور، بمبئی، دہلی اور رامپور میں تو تعزیتی اجلاس بھی منعقد ہوئے اور اخبارات نے انتقال کی بڑی بڑی خبریں بھی لگائیں مگر پاکستان میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب خاموش رہے۔ ایک ہفت روزہ تکبیر کراچی کا واحد رسالہ تھا جس نے سیاہ حاشیہ میں ایک صفحہ پر مولانا کے انتقال پر تعزیتی شذرہ شائع کیا۔ نہ اخبارات کے مدیران کو ہی خیال آیا نہ اہل علم کو، اگر کسی علمی تنظیم نے مولانا کے انتقال کا نوٹس بھی لیا تو بس ریکارڈ درست رکھنے کے لئے ایک تعزیتی قرارداد بنا کر اخبارات کو بھجوادی۔

مولانا کے انتقال کے چند دن بعد جامعہ کراچی کے پروفیسر اور معروف دانشور و شاعر جناب سحر انصاری سے ملاقات ہوئی۔ مولانا کا ذکر آیا تو انھوں نے ایک آہ سرد کھینچی اور دیر تک مفتی صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ کہنے لگے مفتی صاحب یادگارِ زمانہ تھے۔ وہ اتنے بڑے تھے کہ ان

کو دیکھنا اور ان سے نیاز مندی ہمارے لئے بڑائی کا درجہ رکھتی ہے۔ ایسے لوگ جب اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو آنکھیں ہی نہیں دل بھی روتا ہے۔ بقول جگر مراد آبادی

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

اسے اتفاق کہیئے یا مفتی رضا انصاری فرنگی محلی کا روحانی تصرف کہ پروفیسر سحر انصاری نے تعزیتی کلمات میں برجستہ جگر مراد آبادی کا شعر پڑھا اور جگر مراد آبادی سے مفتی صاحب مرحوم کے ایسے دیرینہ قلبی مراسم تھے کہ جب جگر مراد آبادی کے انتقال کی خبر لکھنؤ پہنچی تو آپ فوری طور پر "گونڈہ" پہنچ گئے اور جگر صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی۔ انہی جگر مراد آبادی مرحوم کا ایک شعر مفتی صاحب کی رحلت پر پروفیسر سحر انصاری کی زبان سے ترجمانِ حقیقت بن گیا۔

جولائی ۱۹۹۱ء میں مجھے ندوۃ العلماء پر ایک مقالے کی تیاری کے سلسلہ میں لکھنؤ جانا پڑا۔ اس سفر میں میرے ہمراہ کراچی کے جواں سال عالم دین اور میرے رفیق دیرینہ مولانا شاہ حسین گردیزی بھی تھے۔ دہلی، بریلی، رامپور، پیلی بھیت، کانپور ہوتے ہوئے جب ہم لکھنؤ پہنچے تو سب سے پہلے حضرت شاہ مینا اور حضرت شاہ عبدالرحمٰن سندھی ثمہ لکھنوی کے مزارات پر حاضری دی۔ پھر فرنگی محل گئے۔ فرنگی محل کا جو تصور ذہن میں تھا اس کے برخلاف منظر نگاہ کے سامنے تھا۔ قال اللہ اور قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی صدا کان میں نہیں آئی۔ نہ دوپلی ململ کی ٹوپی اور نہ کلی دار کرتوں میں ملبوس طلبہ دکھائی دیئے اور نہ کسی ڈیوڑھی میں علماء ہی نظر آئے۔ بس ایک عجیب ویرانی فرنگی محل کے دیوار و در پر پھیلی ہوئی تھی۔ بوسیدہ مکانوں اور گرتی ہوئی

دیواروں کے درمیان ایک مکان کے دروازہ پر دھندلی سی تختی آویزاں تھی "محمد رضا انصاری فرنگی محلی" میں نے مولانا شاہ حسین گردیزی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور انھوں نے آگے بڑھ کر دروازہ پر دستک دے دی۔ کچھ دیر بعد ایک بے ریش وجیہ نوجوان دروازہ پر نمودار ہوئے۔ میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو فوراً اندر بلالیا۔ رسمی تعارف سے پتہ چلا کہ وہ مفتی صاحب مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے محمد فائق رضا انصاری ہیں اور لکھنؤ میں ہی مقیم ہیں جبکہ دوسرے صاحبزادے محمد شائق رضا انصاری "فلپین ایرلائنز" میں ملازم ہیں۔ مولانا شاہ حسین گردیزی نے دعائے مغفرت کے بعد گفتگو کا آغاز کیا اور دیر تک مرحوم مفتی صاحب اور فرنگی محل کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی۔ برادرم فائق انصاری نے بتایا کہ مولانا صبغت اللہ شہید کے صاحبزادے مولانا محمد ہاشم فرنگی محلی کی حیات تک باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا لیکن ۱۹۸۸ء میں ان کے وصال کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ابا میاں [مفتی رضا انصاری فرنگی محلی] نے البتہ دارالافتاء جاری رکھا مگر اب وہ بھی نہیں رہا کیونکہ اصولی طور پر اب خاندان میں کوئی اس ذمہ داری کا اہل نہیں رہا۔ مولانا محمد متین انصاری فرنگی محلی جو مولانا محمد قطب میاں فرنگی محلی کے صاحبزادے اور سجادہ نشین ہیں لکھنؤ میں ہی ہومیو پیتھک کلینک کرتے ہیں۔ محل سرا میں کتب خانہ تھا لیکن مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی بناء پر بیشتر کتابیں اور دستاویزات غائب یا ضائع ہو گئیں۔ مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے جو کراچی میں مقیم ہیں اور اس خانوادے کے بزرگ ہیں مناسب نگرانی کے فقدان کی بناء پر کتب خانہ کو مقفل کروادیا ہے۔ ان کے صاحبزادے محمود میاں کی آمد پر یہ کتب خانہ کھلتا ہے اور اسی دوران اس کی جھاڑ پھٹک ہو جاتی ہے۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کا ذاتی کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو

دے دیا گیا تھا۔ ابا میاں نے اپنی بیشتر کتابیں ندوۃ العلماء کی لائبریری کو دے دیں۔ اب صرف فرنگی محل کے دیوار و در رہ گئے ہیں یا ہم، کچھ باقی نہیں رہا، سب ختم ہو گیا۔"

اس مرحلہ پر محمد فائق انصاری کی آواز رندھ گئی۔ انھوں نے کچھ دیر گریہ ضبط کرنے کی کوشش کی مگر پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں اور شاہ حسین بے بس آنکھوں اور بے حرف لہجہ میں یہ سب کچھ دیکھتے رہے مگر تابکے۔ ایک علمی خانوادے کی قدیم اور عظیم روایت کے اختتام کا تصور کر کے ہمارے بھی بدن میں سنسنی دوڑ گئی اور آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

کچھ عجب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے
ہائے زنداں میں بھی کیا لوگ تھے ہم سے پہلے

اس دن تقریباً دو گھنٹے فائق میاں کے ساتھ فرنگی محل میں گزارے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو کے علاوہ فائق میاں نے مدرسہ عالیہ نظامیہ کے بام و در اور معروف علمائے فرنگی محل کی رہائش گاہیں بھی دکھائیں۔ دھول و خاک میں اٹی ہوئی عمارتیں۔ ویران اور اجاڑ۔ ظہر کی اذان سے کچھ قبل فائق میاں سے ہم نے اجازت طلب کی اور امین الدولہ پارک تک جہاں ہم "ہوٹل گلمرگ" میں مقیم تھے ایک گہرے ملال اور تاسف کے عالم میں چلتے رہے۔ خاموش اور گراں بار۔

ہوٹل پہنچ کر بھی میں نے اور شاہ حسین نے باہم کوئی تبادلۂ خیال نہیں کیا۔ بس بستر پر لیٹ کر چھت کو تکتے رہے۔ اسی عالم میں نجانے کب نیند نے آلیا اور جب آنکھ کھلی تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ ابھی ہم ہوٹل سے باہر نکلنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں نے نکل کر دیکھا تو اردو کے معروف محقق اور شاعر حضرت عبدالباری آسی لکھنوی

مرحوم کے صاحبزادے محترم والی آسی جن سے ہماری صبح ملاقات ہو چکی تھی ایک بزرگ کے ہمراہ کھڑے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر والی بھائی سے مصافحہ کیا تو انھوں نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " مولانا محمد متین انصاری فرنگی محلی " اور مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے اچانک بہت سے چراغ روشن کردئے ہوں۔ میں نے حواس باختگی کے عالم میں ان بزرگ کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور فرطِ عقیدت میں بے ساختہ ان سے بغل گیر ہو گیا۔ مجھ پر گریہ طاری تھا اور کسی کے نرم و گرم ہاتھ میری پیٹھ تھپک رہے تھے۔

گرمی اس کے ہاتھوں کی
چشمہ ٹھنڈے پانی کا

عجیب سرمستی اور سرشاری تھی، عجیب واشدگی اور وارفتگی تھی عجیب شفقت اور اپنائیت تھی جو میرے احساس میں منتقل ہو رہی تھی۔ بقولِ شاعر

بس ایک بار کسی نے گلے لگایا تھا
پھر اس کے بعد نہ میں تھا نہ میرا سایہ تھا

ابھی میں مولانا محمد متین انصاری کے سینے سے لگ کر پوری طرح نہ رو سکا تھا اور نہ خوش ہو سکا تھا کہ والی بھائی کی آواز سنائی دی۔ " بس خواجہ صاحب اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اندر چلئے " میں مولانا کا ہاتھ تھامے کمرے میں آگیا۔ شاہ حسین گردیزی سامنے کھڑے اپنا عمامہ درست کررہے تھے۔ میں نے بچشم نم شاہ حسین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " شاہ صاحب۔ حضرت مولانا متین انصاری فرنگی محلی " اور شاہ صاحب آگے بڑھ کر مولانا کے گلے لگ گئے۔ میں اس دوران کبھی والی بھائی کی طرف تشکر آمیز آنکھوں سے دیکھتا اور کبھی مولانا کی طرف۔ فربہی مائل بدن، چمکتا ہوا صاف رنگ پستہ قد،

سنہری کمانی کی عینک سے جھانکتی ہوئی روشن آنکھیں، مٹھی بھر داڑھی، سفید چکن کا کلی دار کرتا، علی گڑھ کاٹ پائجامہ، ململ کی دو پلی ٹوپی، سلیم شاہی جوتا، ہاتھ میں چھوٹا سا چرمی بیگ، پر کشش اور وضعدار شخصیت جس کو دیکھ کر فرنگی محل کی نسلی وجاہت، تہذیبی روایت اور روحانی ولایت پر باآسانی ایمان لایا جا سکتا تھا۔

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے بھائی والی آسی سے عرض کیا۔ " آپ نے ناحق مولانا کو زحمت دی۔ ہم تو خود مولانا کی زیارت کے لئے کلینک جانے والے تھے۔ " مولانا کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی اور والی بھائی فرمانے لگے۔ " خواجہ صاحب صبح جب آپ سے مولانا کا تذکرہ ہوا تھا اس کے بعد ہی میری مولانا سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے آپ کی آمد اور ملاقات کے اشتیاق کا تذکرہ کیا تو مولانا نے فوراً فرمایا "چلو ملواؤ " مگر آپ تو " ندوہ " چلے گئے تھے اس لئے میں نے مولانا سے شام کا وقت لے لیا تھا۔ " درمیان میں مولانا نے بھی تائیدی نظروں سے والی بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا " چلئے مقصود ملاقات تھی۔ سو وہ ہو گئی۔ آپ آئیں یا میں آؤں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی آپ ہمارے مہمان ہیں " مولانا نے اپنی بات مکمل کی تو میں نے اپنا مختصر سا تعارف کرانے کے بعد مولانا شاہ حسین گردیزی کے بارے میں بتایا کہ کراچی میں " دارالعلوم مہریہ " کے ناظم و مدرس ہیں۔ تصنیف و تالیف سے بھی شغف ہے۔ راولپنڈی کے قریب دربار عالیہ گولڑہ شریف کے فیض یافتہ ہیں۔ گولڑہ شریف کا نام سن کر مولانا متین انصاری فرمانے لگے۔ " حضرت پیر سیدؒ مہر علی شاہ گولڑویؒ تو بیسویں صدی کے ولی کامل تھے۔ ان کے فضل و کمال سے تو پورے برصغیر کے اہل علم واقف ہیں۔ ہم نے تو ان کی دو ایک تصانیف دیکھی ہیں

ہمارے والدِ ماجد حضرت مولانا قطب الدین انصاری کو زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا لیکن ہمیں ان کے فرزند گرامی حضرت غلام محی الدین گولڑوی، عرف بابو جی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔" میں نے درمیان میں عرض کیا کہ " شاہ حسین گردیزی صاحب کو قبلہ بابو جی سے ہی شرف بیعت حاصل ہے " میری بات سن کر مولانا کے چہرے پر ایک سرخی دوڑ گئی اور انھوں نے کھڑے ہو کر ایک مرتبہ پھر شاہ حسین گردیزی سے معانقہ کیا اور دیر تک ماشآء اللہ، ماشآء اللہ کہتے رہے۔ پھر ارشاد فرمایا " قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد قبلہ بابو جی لکھنؤ تشریف لائے تھے اور پورا دن فرنگی محلی میں گزارا تھا۔ اس زمانہ میں فرنگی محل میں علماء کا میلہ ہوتا تھا۔ حضرت مولانا مفتی عبدالقادر فرنگی محلی، صاحب سجادہ مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی، مولانا صبغت اللہ شہید، میرے والد قطب الدین فرنگی محلی، مفتی محمد عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا محمد سخاوت اللہ فرنگی محلی اور مولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی سب ہی موجود تھے۔ ہم اس وقت نوجوان تھے اس لئے ہم کو ہی عم محترم عبدالقادر فرنگی محلی نے قبلہ بابوجی کی خدمت پر مامور کردیا تھا۔ بابو جی بہت وجیہہ اور خوبصورت تھے۔ پر تکلف لباس زیب تن نہ کرنے کے باوجود ان کی جامہ زیبی نظر نواز تھی۔ بیشتر خاموش رہتے تھے لیکن جب گفتگو فرماتے تو اتنی جامع اور عمیق کہ علماء ہمہ تن گوش ہی نہیں انگشت بدندان رہ جاتے۔ بابو جی کی آمد پر فرنگی محل پر ایک خلقت کا ہجوم تھا۔ علماء اور عوام سب ہی بابو جی کی زیارت کو دن بھر آتے رہے۔ آپ لوگوں سے مصافحہ بھی کرتے جاتے اور اطراف میں بیٹھے ہوئے علماء کرام سے مختلف مسائل و معاملات پر گفتگو بھی کرتے جاتے۔ ہم نے پیر اور سجادہ نشین تو بہت دیکھے ہیں لیکن قبلہ بابو جی جیسا کاملِ ظاہر و باطن کوئی نہیں دیکھا۔ ہمارے والد ماجد فرماتے تھے کہ جہاں علم اس قدر

بے پایاں ہو وہاں سجادگی شریعت و طریقت کا معیار ہوجاتی ہے۔ واقعی بابو جی ایسے ہی تھے۔ شریعت اور طریقت کا معیار۔

مولانا محمد متین انصاری فرنگی محلی نے مزید فرمایا کہ قبلہ بابو جی کی دوسری مرتبہ مجھے زیارت کا شرف حج بیت اللہ کے موقع پر ۱۹۶۴ء میں منیٰ میں ہوا۔ جہاں وہ اپنے مریدانِ باصفا کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ فرنگی محلی سے بھی ایک قافلہ اس سال حج پر گیا تھا جس میں مفتی عبدالقادر، مولانا قطب الدین اور میرے علاوہ دیگر صاحبانِ سلسلہ بھی شامل تھے۔ پاکستان سے مولانا جمال میاں فرنگی محلی بھی تشریف لائے تھے۔ اجمیر شریف کے متولی صاحب سیّد سردار احمد نے ہم کو قبلہ بابو جی کی منیٰ میں موجودگی کی اطلاع دی اور ہم ان کی زیارت کو پہنچ گئے۔ قبلہ بابو جی نے بے پناہ محبت و شفقت کا مظاہرہ فرمایا۔ علیحدہ علیحدہ سب سے معانقہ کیا اور باقاعدہ ایک ضیافت کا اہتمام کر ڈالا۔ اس موقع پر بابو جی کے مخصوص قوال نے بغیر سازوں کے عارفانہ کلام بطرزِ قوالی پیش کیا۔ متین میاں نے فرمایا " اگر چہ یہ ملاقاتیں مختصر سی ہی تھیں لیکن آج تک میرے قلب و ذہن میں زندہ و تازہ ہیں۔ "

مولانا متین انصاری فرنگی محلی سے اس شام تقریباً دو گھنٹہ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی رہی۔ انھوں نے جہاں ایک طرف اپنے خانوادۂ علمی کے بارے میں نادر معلومات بہم پہنچائیں وہاں لکھنؤ کی علمی اور مذہبی صورت حال پر بھی سیر حاصل گفتگو کی۔ خصوصاً مولانا رضا انصاری فرنگی محلی کی علمی اور مذہبی خدمات کا ذکر انھوں نے بہت تفصیل سے کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مفتی صاحب کچھ دن اور اگر زندہ رہتے تو وہ علمی نوعیت کی مزید وقیع خدمات سر انجام دیتے۔ کیونکہ ان کے اندر نہ صرف بے پناہ علمی استعداد اور تخلیقی صلاحیت تھی بلکہ ایک ایسی لگن بھی تھی جو ان کو آرام سے بیٹھنے نہیں دیتی

تھی۔ وہ ایک تحریکی آدمی تھے۔ خصوصاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستگی کے بعد سے تو وہ بہت سنجیدگی سے اپنے خانوادے کے حوالے سے تصنیف و تالیف میں مشغول تھے مگر مشیتِ ایزدی میں کس کو دخل ہو سکتا ہے۔ اب پاکستان میں جمال میاں ہیں اور یہاں ہم اور ہم بھی اب چراغِ سحری ہیں۔
لکھنؤ میں تقریباً ایک ہفتہ ہمارا قیام رہا۔ اس دوران ندوہ العلماء کے ناظم اعلیٰ اور معروف اسکالر مولانا ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر اور معروف مصنف مولانا شمس تبریز خان، ممتاز ڈگری کالج کے پروفیسر ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی سے جنھوں نے علامہ شبلی نعمانی پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا تھا جزوی اور تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ والی بھائی کے توسط سے رئیس انصاری اور دیگر شعراء سے بھی استفادے کا موقع ملا لیکن مولانا متین میاں سے تقریباً ہر روز ہی شرفِ کلام و نیاز حاصل ہوتا رہا۔ وہ عجیب سادہ دل اور روشن ضمیر آدمی تھے۔ کہ آج جب میں ان کی یادوں کے حجلہ انوار میں بیٹھا بادیدہ نم یہ سطور تحریر کررہا ہوں تو میرا دل نہایت خاموشی اور انہماک کے ساتھ ان کی درازیٔ عمر اور مولانا رضا انصاری فرنگی محلی کی مغفرت کے لئے مصروفِ دعا ہے۔

خواجہ رضی حیدر کی دیگر کتابیں

تصانیف

قائداعظم کے ۷۲ سال —— نفیس اکیڈمی، کراچی ——

تذکرۂ محدث سورتی —— سورتی اکیڈمی، کراچی ——

قائداعظم خطوط کے آئینے میں —— نفیس اکیڈمی، کراچی ——

قراردادِ پاکستان —— سورتی اکیڈمی کراچی ——

حافظ محمد زاہد کے شخصی خطوط —— دبستانِ بیل بھیت، کراچی ——

عبدالحفیظ نعیمی، شخصیت اور شاعری —— دبستانِ بیل بھیت، کراچی ——

رتی جناح (قائداعظم کی اہلیہ) —— (زیر طبع) —— نفیس اکیڈمی، کراچی

بے دیار شام (شعری مجموعہ) —— (زیر طبع) —— نفیس اکیڈمی، کراچی

سیرِ چراغاں (شخصی خاکے) —— (زیر طبع) —— نفیس اکیڈمی، کراچی

تراجم

"میرا بھائی" —— تصنیف، محترمہ فاطمہ جناح —— قائداعظم اکادمی کراچی

قائداعظم حیات و خدمات —— تصنیف، شریف المجاہد —— قائداعظم اکادمی، کراچی

قراردادِ پاکستان —— تصنیف، لطیف احمد شیروانی —— قائداعظم اکادمی، کراچی

تدوین

"اُستاذ العلماء" —— تصنیف، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی —— مکتبۂ قادریہ لاہور

"شاخِ مرجاں" —— علامہ رشید ترابی کا شعری مجموعہ —— ترابی پبلیکیشنز کراچی

"ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی" —— شخصیت و خدمات —— سورتی اکیڈمی کراچی